اسماء قادری

اسماء قادری

وہ پری کہاں سے لاؤں
تیری دلہن جسے بناؤں
کہ گوری کوئی پسند نہ آئے تجھ کو
کہ چھوری کوئی پسند نہ آئے تجھ کو

چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اقصیٰ شوخی سے گنگنائی تو امینہ بیگم اور ندا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بدتمیز' مذاق اُڑا رہی ہو میرا۔" حسن نے چائے رکھنے کے لیے جھکی ہوئی اقصیٰ کا کان پکڑا۔

"اف حسن بھائی! چھوڑیں نا' بہت درد ہو رہا ہے۔" اقصیٰ نے التجا کی اور پھر مدد طلب نظروں سے امینہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"چھوڑ دو حسن! میری بیٹی کو۔ اس کا کیا قصور ہے۔ تم خود ہی اپنا مذاق بنوانے پر تلے ہوئے ہو۔" امینہ بیگم نے فوراً اپنی لاڈلی کی حمایت کرتے ہوئے حسن کو ڈانٹا تو اس نے بادل ناخواستہ اقصیٰ کا کان چھوڑ کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔ اقصیٰ امینہ بیگم کے ساتھ لگ کر ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اپنا کان سہلانے لگی۔

"خوامخواہ تم نے بچی کا کان سرخ کر ڈالا' ورنہ اس نے اس وقت میرے جذبات کی بالکل صحیح ترجمانی کی ہے۔ مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے لیے لڑکی تلاش کرنے کے لیے کون سے کنوؤں میں بانس ڈلواؤں۔ جان پہچان' عزیز رشتے دار' محلے دار سب کو کھنگال ڈالا ہے لیکن تم ہو کہ کسی لڑکی پر ہاں کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔" ندا نے بھی اقصیٰ کی حمایت کرتے ہوئے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"دکھائیں تو ندا باجی! آج کس بے چاری کو رد کیا ہے؟

مکمل ناول

حسن بھائی نے۔" اقصیٰ نے تصویر لینے کے لیے ندا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"افشاں نام ہے' میری نند کے جیٹھ کی بیٹی ہے۔ اتنی پیاری ہے کہ اندھیرے کمرے میں بٹھاؤ تو کمرہ جگ مگ کرنے لگے لیکن ہمارے بھائی صاحب کی وہی ایک نا ہے۔" ندا نے اسے تصویر تھماتے ہوئے شکوہ کیا۔

"واقعی حسن بھائی! ندا باجی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ تو بہت پیاری لڑکی ہے۔ آپ فٹافٹ ہاں کردیں' ورنہ بعد میں پچھتائیں گے۔" تصویر دیکھتے ہوئے اقصیٰ نے ندا کی حمایت کی۔

"آخر تم لوگوں سے کس نے کہہ دیا ہے کہ میں کسی حور پری کا متلاشی ہوں یا مجھے حسینۂ عالم سے شادی کرنی ہے جو ہر روز ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ کی تصویر لیے میرے پاس چلے آتے ہو۔ میں حسن وغیرہ کا طلب گار نہیں ہوں لیکن بس اتنا چاہتا ہوں کہ لڑکی وہ ہو جسے دیکھ کر میرا دل خود بول اٹھے "یس" یہی ہے وہ جس کی مجھے تلاش ہے۔" حسن نے جھنجلاتے ہوئے اپنا ہمیشہ والا مؤقف دہرایا۔

"اب تمہارے دل کی "یس" کا انتظام ہم کیسے کریں۔ ہمیں تو بظاہر جو لڑکی اچھی لگتی ہے' تمہیں دکھا دیتے ہیں لیکن سچ بڑی شرمندگی ہوتی ہے اس طرح لڑکیاں ریجیکٹ کرنے سے۔"

"تو آپ نہ کیا کریں نا یہ لڑکیاں دکھانے والا کام۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن وہ لڑکی خود ہی میری زندگی میں چلی آئے گی۔" ندا کی بات پر اس نے بہت پریقین انداز میں کہا۔

"لیکن بیٹا کب؟ اٹھائیس سال کے ہو چکے ہو تم' یہی مناسب وقت ہے شادی کے لیے پھر میرا ابھی تو ارمان ہے پوتے پوتیوں کو کھلانے کا۔ جانتے ہی ہو ماں دمے کی مریضہ ہے' کب سانس اکھڑ جائے خبر نہیں۔ مرنے سے پہلے اگر تمہیں آباد دیکھ لیتی تو اس دل کو اطمینان رہتا۔" امینہ بیگم بولتے بولتے کچھ جذباتی ہوگئی تھیں' ان کے ساتھ بیٹھی اقصیٰ نے جھٹ انہیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

"ایسی بات مت کریں خالہ جان! ابھی آپ کو بہت لمبے عرصے تک جینا ہے۔ حسن بھائی کی شادی' ان کے بچوں کی پرورش' ندا باجی کے بچوں کی شادیاں' سب کام آپ نے ہی کروانے ہیں۔ آپ کہاں ابھی سے جانے کی باتیں کرنے لگیں۔" امینہ بیگم سے لپٹی اقصیٰ' کے لہجے میں کیسا خوف تھا' وہ اچھی طرح محسوس کر سکتی تھیں۔ چنانچہ اس کا موڈ تبدیل کرنے کے لیے اپنے لہجے کو خوشگوار کرتے ہوئے بولیں۔

"اور تم... تمہارا بھی تو کچھ انتظام کرنا ہے مجھے۔ تمہیں اس گھر سے رخصت کیے بغیر تو میں اس دنیا سے نہیں جاسکتی۔"

"مجھے نہیں ہونا رخصت۔ میں یہیں آپ کے ساتھ رہوں گی ہمیشہ۔" اس نے امینہ بیگم کے گرد بازوؤں کا حصار کچھ اور بھی مضبوط کردیا لیکن یہ سب کہتے ہوئے اس کے نوخیز چہرے پر جو سرخی سی چھائی تھی' اسے دیکھ کر' ماحول کی سنجیدگی سے رنجیدہ ہوجانے والے حسن اور ندا کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

امینہ بیگم اور زرینہ دو ہی بہنیں تھیں۔ دونوں بہنوں کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔ چنانچہ جب امینہ بیگم بیاہ کر سسرال گئیں تو زرینہ ہی ماں باپ کے پیار کی تنہا حق دار ٹھہریں۔ والدین سفید پوش لوگ تھے لیکن مختصری فیملی اور بھلا زمانہ تھا۔ مہنگائی نے سفید پوش لوگوں کی آج کی طرح کمر نہیں توڑ رکھی تھی' اس لیے گزارا بھی اچھا ہوتا تھا اور والدین زرینہ کی فرمائشیں بھی آسانی سے پوری کروایا کرتے تھے۔ گھرداری کے جھمیلوں میں الجھی امینہ بیگم کبھی کبھی ہی میکے آتیں مگر جب بھی آتیں زرینہ کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور ساتھ ہوتا تھا۔ دراصل انہیں خود بھی اپنے سے کئی سال چھوٹی زرینہ سے بہت پیار تھا اور صاحب اولاد ہوجانے کے باوجود اس محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بچوں نے زرینہ کے حصے کی محبت بانٹی نہیں تھی بلکہ وہ خود زرینہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنی نک سک سے تیار رہنے والی' شوخ و شنگ خالہ انہیں بہت پسند تھیں۔ جب نانا' نانی آگے پیچھے دنیا سے گزرے اور خالہ ان کے گھر رہنے کے لیے آگئیں تو بچے ماں اور خالہ کے قلبی دکھ کو سمجھے بغیر بہت خوش ہوئے۔ گزرتے وقت اور بچوں کی مصروفیات نے دونوں بہنوں کو جلد ہی سنبھالا دیا۔ امینہ بیگم کو اب اگر کوئی فکر تھی تو صرف زرینہ کی کسی اچھی جگہ شادی کی۔ جلد ہی انہوں نے ایک اچھا سا رشتہ بھی ڈھونڈ نکالا۔ مگر زرینہ کے الفاظ نے ان کی خوشی چھین لی۔

"میں آپ کے طے کیے ہوئے رشتے کو قبول نہیں کرسکتی آپا! کیونکہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔" زرینہ کے ان الفاظ پر امینہ بیگم کچھ پل کے لیے ساکت ہی رہ گئیں لیکن پھر انہوں نے تدبر سے کام لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کون ہے وہ شخص؟ اگر ایسی کوئی بات تھی تو تم نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"تنویر خان نام ہے اس کا۔ جس محلے میں ہم رہتے تھے' وہیں رہتا ہے۔ رہی یہ بات کہ میں نے پہلے کیوں نہیں بتایا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ میری شادی کے لیے اتنی جلدی مچائیں گی لیکن اب جبکہ آپ ایسا چاہ ہی رہی ہیں تو جان لیں کہ میں اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پر صرف اور صرف تنویر خان کو ہی قبول کرسکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تم اس سے کہو کہ رشتہ لینے اپنے گھر والوں کو یہاں بھیجے۔ جب وہ لوگ رشتہ لائیں گے تب ہی ہم کچھ کرسکیں گے۔" زرینہ کے لہجے کی قطعیت کو محسوس کرتے ہوئے امینہ بیگم نے کہا۔ تنویر خان تو گویا ایسے کسی اشارے کا منتظر ہی بیٹھا تھا' جھٹ اگلے ہی اتوار کو اپنے بھائی' بھابھی کو امینہ بیگم کے گھر بھیج دیا۔

"تنویر میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کی بہن سے اس کے رشتے کی بات کرنے آپ کے گھر جاؤں تو میں آگیا۔ آگے آپ کے کیا ارادے ہیں' وہ آپ بتائیں' ہم نے تو اپنے حصے کی ذمہ داری پوری کردی۔ آگے گھر سنبھالنا اور چلانا ان دونوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔" تنویر کا بھائی بین السطور کیا کہنا چاہ رہا ہے' امینہ بیگم خوب سمجھ رہی تھیں۔ اس شخص نے واضح کردیا تھا کہ وہ صرف بھائی کے کہنے پر رشتہ لے کر آیا ہے لیکن وہ اپنے بھائی کے سلسلے میں کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس بات نے امینہ بیگم کے دل میں کھٹکا سا پیدا کردیا لیکن تنویر خان کے بھائی' بھابھی پر کچھ ظاہر کیے بغیر انہوں نے سوچنے کا وقت لے کر قرینے سے انہیں گھر سے رخصت کرایا۔

اصل میں ان کی شادی کو تو کئی سال ہو چکے تھے اور تنویر خان کی فیملی ان کی شادی کے بعد ہی ان کے میکے والے محلے میں آکر بسی تھی' اس لیے وہ ان لوگوں کے بارے میں واقف نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر مکرم علی کے ذمے تنویر خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کام لگایا اور پھر جو اطلاعات مکرم علی نے دیں' وہ کچھ خوش کن نہیں تھیں۔ تنویر خان کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ خاصا لاابالی اور غیر ذمہ دار شخص ہے جو زیادہ عرصہ کسی جگہ ٹک کر نوکری نہیں کرتا اور اکثر بے روزگار ہی رہتا ہے۔ بے روزگاری کے یہ دن وہ عموماً محلے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر گزارا کرتا تھا۔ تاش کھیلنا اور آتی جاتی لڑکیوں کو چھیڑنا ان لڑکوں کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ تنویر خان شکل و صورت کا اچھا تھا' اس لیے لڑکیاں اس کی طرف جلدی متوجہ ہوجاتی تھیں۔ ان ہی بے وقوف لڑکیوں میں ایک زرینہ بھی تھی۔ بس زرینہ کا معاملہ اس اعتبار سے مختلف تھا کہ تنویر خان اس سے شادی میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ سب جان کر امینہ بیگم نے طے کرلیا کہ وہ ہرگز زرینہ کی شادی اس آوارہ شخص سے نہیں کریں گی لیکن ایک بار پھر زرینہ ان کے ارادوں کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوگئی۔

"مجھے تنویر سے ہر حال میں شادی کرنی ہے' وہ برا ہے تب بھی۔ اگر اس سے شادی کرکے مجھے تکلیف اٹھانی پڑی تو میں رونے کے لیے آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔" زرینہ نے بہت فیصلہ کن اور اکھڑ انداز میں ان سے یہ بات کہی تھی لیکن امینہ بیگم اسے یوں گڑھے میں گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں' اس لیے انہوں نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔

"تم ابھی نادان ہو' تمہیں اپنے اچھے برے کا نہیں معلوم لیکن میں سمجھ عقل رکھتے ہوئے تمہیں ایک غلط کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ میری طرف سے اس رشتے کے لیے انکار ہے۔"

"ایسی صورت میں' میں اور تنویر کورٹ میرج کرلیں گے۔"

زرینہ نے بے باکی سے انہیں دھمکی دی تھی۔ یہ دھمکی دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو بغاوت تھی' اس نے امینہ بیگم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔ ان کی اپنی بیاہتا زندگی تھی' اگر زرینہ اپنی دھمکی کے مطابق عمل کر گزرتی تو امینہ بیگم کے لیے اپنے شوہر اور سسرالی رشتے داروں کا سامنا کرنا مشکل ہوجاتا۔ انہوں نے زرینہ کی ضد مان کر اس کی تنویر خان سے شادی کردی۔ شادی کو مشکل سے پونے چار سال ہی گزرے تھے کہ زرینہ اپنی ڈھائی سال کی

بیٹی کو لے کر ان کی دہلیز پر چلی آئی۔

"وہ شخص نکھٹو اور آوارہ ہی نہیں، بدکردار اور بے غیرت بھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی عیاشیوں کی خاطر حلال حرام کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کر گزروں لیکن میں اتنی بری عورت نہیں ہوں آپا! میں نے اس کے گھر میں رہ کر اپنے جسم وجاں پر بہت ظلم سہے ہیں لیکن مجھے اپنی عزت کا سودا منظور نہیں۔ اگر آپ مجھے اور میری بچی کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر سمندر کی لہریں ہم ماں بیٹی کا ٹھکانہ ہوں گی۔" کمزور، ناتواں زرینہ نے روتے ہوئے بہن کے سامنے اپنا مدعا پیش کیا تو امینہ بیگم کو بے ساختہ ہی چار سال پہلے کہی گئی اس کی بات یاد آگئی۔

کس کروفر سے اس نے کہا تھا۔

"اگر تنویر سے شادی کرکے مجھے تکلیف اٹھانی پڑی تو میں رونے کے لیے آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔"

لیکن اب وہ اپنے دعوے کے برخلاف یہاں موجود تھی۔ جذبات میں کیے گئے ایسے دعوے عموماً بودے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ دعوا تو امینہ بیگم نے بھی زرینہ کو اپنے گھر سے رخصت کرتے ہوئے کیا تھا کہ اب وہ مرتے دم تک اس کی شکل نہیں دیکھیں گی لیکن جب ماں جائی روتی بلکتی دہلیز پر آئی تو ان کے لیے اسے ٹھکرانا ممکن نہ ہوا۔ شوہر کے تفکرات اور بیاہی نندوں کے طعنے سب انہوں نے اپنی اس نافرمان بہن کی خاطر سن لیے۔ زرینہ ان کے گھر میں اوپر کے پورشن میں بنے ایک کمرے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے لگی۔ زرینہ کی بیٹی زرینہ کا عکس تھی۔ امینہ بیگم کے دونوں بچوں ندا اور حسن نے ہاتھوں ہاتھ اس بچی کو لیا۔ اقصیٰ کے آنے سے گھر میں رونق سی چھا گئی۔ اس کی قلقاریاں اور پیاری پیاری ادائیں گھر بھر کو اس کی طرف متوجہ رکھتیں لیکن زرینہ یہاں آکر بچی کی طرف سے بالکل غافل ہو گئی تھی یا پھر یہ تھا کہ اسے بچی کی طرف سے اطمینان تھا۔ اقصیٰ سب کی توجہ کا مرکز بنی ہاتھوں ہاتھ رہتی اور زرینہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے سارا سارا دن وہیں گزار دیتی۔ تنویر بھی پلٹ کر اس کا حال پوچھنے نہیں آیا تھا۔ خود امینہ بیگم کے دل میں بہن کے لیے گلہ تھا، اس لیے انہوں نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور جب توجہ دی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پچھتاوؤں اور دکھوں میں گھری زرینہ کے جسم میں کینسر کے موذی مرض نے پنجے گاڑھ لیے تھے۔ معدہ کا کینسر اس کی جان کو ایسا لگا کہ پھر جان لے کر ہی ٹلا۔ امینہ بیگم کو بہن سے پیار بھی بہت تھا اور اس کے اس طرح گھٹ گھٹ کر مرجانے میں انہیں اپنی بے توجہی کا ہاتھ بھی دکھائی دیتا تھا۔ سو انہوں نے بہن کی اولاد کو سینے سے لگا کر اس کے حصے کا سارا پیار اور توجہ بھی اس پر لٹا دیا۔ اقصیٰ ان کی آنکھوں کا تارا تھی جس سے صرف وہ ہی نہیں گھر بھر پیار کرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرکے حسن سونے کے لیے اپنے بیڈ پر آیا تو دیکھا، سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا جگ خالی ہے۔ اسے کچھ کوفت کا احساس ہوا۔ خالی جگ کا مطلب تھا کہ اسے خود نیچے جاکر فریج میں سے ٹھنڈا پانی لانا پڑتا۔ تمام تر تھکن کے باوجود اسے یہ کام کرنا ہی تھا کیونکہ اگر رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ پانی کا ایک گلاس لازما" پیتا تھا۔ دوسری صورت میں اسے دوبارہ نیند ہی نہیں آتی تھی۔ ناچار وہ جگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکلا۔ سیڑھیاں اترتے ہی اسے احساس ہوا کہ نیچے کے پورشن میں مکمل خاموشی ہے۔

اگرچہ ابھی رات بہت گہری نہیں ہوئی تھی لیکن سہ پہر کے بعد گھر والوں نے چند گھنٹے اتنے شدید اعصابی دباؤ میں گزارے تھے کہ اب ان کو واقعی آرام کی ضرورت تھی۔ آج پھر اچانک امینہ بیگم کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ ان کا سانس اس بری طرح اکھڑا تھا کہ ان ہیلر دینے کے باوجود وہ سنبھل نہیں پا رہی تھیں۔ وہ تو شکر تھا کہ مکرم علی گھر پر موجود تھے۔ انہوں نے امینہ بیگم کو فوری طور پر ہسپتال پہنچایا، جہاں انہیں طبی امداد دی گئی۔ حسن اس وقت آفس میں تھا جب اقصیٰ نے فون پر روتے ہوئے اسے امینہ بیگم کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع دی۔ وہ سب کام چھوڑ چھاڑ سیدھا ہسپتال کی طرف بھاگا۔ ہسپتال پہنچا تو امینہ بیگم ابھی آئی سی یو میں تھیں جبکہ مکرم علی اور اقصیٰ پریشانی کے عالم میں باہر ٹہل رہے تھے۔ اقصیٰ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے، جنہیں وہ بے دردی سے اپنے دوپٹے سے صاف کرتی زیر لب دعائیں پڑھنے میں مصروف تھی۔ ٹریٹمنٹ کے بعد امینہ بیگم کی حالت سنبھل گئی تھی لیکن اقصیٰ کا برا حال تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اس عرصے میں ہی وہ خوف سے نچڑ گئی تھی۔ امینہ بیگم بھی طبیعت سنبھل جانے کے باوجود کافی نڈھال نظر آرہی تھیں لیکن

انہوں نے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا قبول نہیں کیا اور چند گھنٹوں بعد ہی اصرار کرکے گھر واپس آگئیں۔ گھر آنے کے بعد اقصیٰ مسلسل ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہی تھی۔ نو بجے کے بعد جب حسن اپنے کمرے میں گیا تو اقصیٰ امینہ بیگم کے پاس ہی تھی۔ خود حسن کا بھی ان کے پاس سے اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اسے آفس کے کچھ اہم کام نمٹانے تھے، اس لیے اوپر کے پورشن میں بنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پہلے یہ کمرہ زرینہ خالہ اور اقصیٰ کے استعمال میں تھا لیکن زرینہ خالہ کے انتقال کے بعد اقصیٰ، ندا کے ساتھ اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئی تھی اور وہ کمرہ حسن کو مل گیا تھا۔ اب ندا کی شادی کے بعد ندا کا کمرا اقصیٰ کی ملکیت تھا۔ حسن فریزر میں سے برف کی کیوبز نکالنے کے لیے فریزر کھول رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اقصیٰ کے کمرے کی لائٹ آن ہے۔ دروازے کے نیچے موجود ہلکی سی درز میں سے روشنی کی لکیر باہر آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی جاگ رہی ہے، ورنہ وہ ندا ہی کی طرح مکمل تاریکی میں سونے کی عادی تھی۔ حسن نے فریزر بند کیا اور اقصیٰ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے تشویش تھی کہ کہیں وہ رو نہ رہی ہو۔ امینہ بیگم کی طبیعت کی خرابی کا وہ ہمیشہ ہی بہت اثر لیتی تھی۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا وا کرکے اندر جھانکا۔ اقصیٰ بیڈ پر کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود قلم نوٹ بک پر تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ اتنی مصروف تھی کہ اسے حسن کے دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں جھانکنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ حسن نے بھی اسے مخاطب کیے بنا دروازہ آہستگی سے دوبارہ بند کیا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہا تھا۔ چائے چڑھانے کے بعد اس نے کیبنٹس کھول کر تلاشی لی تو اسے ایک جار میں رکھے کوکیز مل گئے۔ کوکیز ایک پلیٹ میں نکالنے کے بعد اس نے پلیٹ ٹرے میں رکھی اور پھر لاؤنج میں فریج تک گیا۔ فریج کا جائزہ لینے پر اسے اس کیک کا بچا ہوا ایک بڑا سا ٹکڑا نظر آیا جو کل شام وہ ندا اور اس کے بچوں کی آمد پر چائے پر لایا تھا۔ کیک پیس نکال کر وہ کچن میں واپس آیا اور اسے بھی کوکیز کے ساتھ ہی ٹرے میں رکھ دیا۔ اس دوران چائے تیار ہو چکی تھی۔ دو کپوں میں چائے نکال کر کپ ٹرے میں رکھے۔

ابھی کچھ دیر قبل اقصیٰ کے کمرے میں جھانکتے ہوئے ہی اسے یاد آیا تھا کہ آج کل اقصیٰ کے کالج میں پریلمنری ایگزامینیشن چل رہے تھے۔ سارا دن امینہ بیگم کے ساتھ گزارنے کی وجہ سے یقیناً وہ اپنے کل کے پیپر کی تیاری نہیں کر سکی تھی، اس لیے اب کتاب کھولے اس میں غرق تھی۔ حسن کو یاد تھا کہ جب اس نے امی اور ابو کو رات کا کھانا سرو کیا تھا تو یہ کہہ کر کہ "بعد میں کھالوں گی" خود کھانے میں شامل نہیں ہوئی تھی۔ حسن جانتا تھا کہ اس نے بعد میں بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا، اسی لیے اس نے اس وقت یہ سارا اہتمام کیا تھا۔ ٹرے اٹھا کر اس نے کچن کی لائٹ آف کی اور اقصیٰ کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دائیں ہاتھ سے ٹرے سنبھالتے ہوئے اس نے بائیں

ہاتھ سے دروازہ کھولا۔ اقصیٰ اب بھی پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس بار حسن نے دروازہ کھولنے میں پہلے جیسی احتیاط سے کام نہیں لیا تھا' اس لیے اس کا انہماک قائم نہیں رہ سکا اور اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"حسن بھائی آپ..... یہ سب کیا ہے؟" وہ حسن اور اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"یہ وہ ایندھن ہے جو انسانی جسم کی مشین کو چلانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔" حسن نے کتابیں سمیٹتے ہوئے بیڈ پر ہی ٹرے رکھنے کی گنجائش نکالی اور خود رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی چیئر کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔

"لیکن آپ کو کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟" وہ الجھی۔ امینہ بیگم گھر کے کام مردوں سے کروانے کو معیوب سمجھا کرتی تھیں اور ان کی یہ سوچ اقصیٰ میں بھی منتقل ہوئی تھی۔

"ضرورت اس لیے تھی کہ مجھے معلوم ہے کہ تم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا اور ابھی تمہیں بہت دیر تک جاگ کر پڑھنا ہے۔ خالی پیٹ میں چوہوں کی ہوتی جنگ کے ساتھ کیا خاک پڑھائی ہو سکتی ہے۔" حسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تھینک یو حسن بھائی!" اقصیٰ کی آنکھیں اس محبت پر چھلک پڑیں۔

"خبردار! اس وقت کسی جذباتی سین کی قطعاً" کوئی گنجائش نہیں۔ تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ پندرہ منٹ میں کھاؤ پیو اور پھر فریش ہو کر دوبارہ پڑھائی میں جت جاؤ۔ مجھے بھی اب جا کر سونا ہے' ورنہ صبح آنکھ مشکل سے کھلے گی۔" حسن نے اسے ٹوکتے ہوئے ذرا رعب سے کہا تو اس نے فوراً" آنسو صاف کر لیے اور کیک کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جبکہ حسن نے صرف چائے پر اکتفا کیا تھا۔

"کل کس چیز کا پیپر ہے؟"

"میتھمیٹکس کا۔ جب ہی تو جاگ رہی ہوں۔ کوئی اور سبجیکٹ ہوتا تو بغیر پڑھے بھی آرام سے پیپر دے دیتی۔"

"تم لڑکیوں کا جس سبجیکٹ میں دماغ نہیں چلتا' اسے لینے کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے ایجوکیشن' سوشیالوجی یا امورِ خانہ داری جیسے مضامین لیتیں اور بی اے کر کے مزے سے گھر بیٹھتیں۔" حسن جانتا تھا کہ اسے انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا کتنا شوق ہے۔ فرسٹ ایئر میں اس کی پرسنٹیج کافی اچھی تھی اور یقین تھا کہ اگر سیکنڈ ایئر میں بھی اس نے اپنی پرسنٹیج مین ٹین رکھی تو اسے آرام سے ایڈمیشن مل جائے گا۔

"جب یہ لڑکی سول انجینئرنگ کی ڈگری لے گی تو آپ خود فخر سے لوگوں میں اسے متعارف کروائیں گے پھر پوچھوں گی آپ سے کہ لڑکیوں کا دماغ کس سبجیکٹ میں نہیں چلتا۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ حسن اسے چھیڑ رہا ہے' اس لیے خود بھی خوشگوار انداز میں بولی تھی۔

"یعنی کہ چیلنج کر رہی ہیں مس اقصیٰ ہمیں۔" حسن اب بھی باز نہیں آیا تھا۔

"جی ہاں' بالکل اور دیکھیے گا کہ یہ چیلنج ایک دن پورا بھی ہوگا۔" اقصیٰ کی آنکھوں میں عزم تھا۔

"دیکھ لیں گے بھئی' ابھی تو یہاں سے رخصت ہوتے ہیں' ورنہ کل کلاں کو اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو تم کہو گی کہ کسی سازش کے تحت تمہیں پڑھائی کے دوران ڈسٹرب کر کے ناکام کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔" حسن کی چائے ختم ہو گئی تھی' اس لیے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ساری رات جاگنے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے سو بھی جانا' ورنہ صبح ذہن فریش نہیں ہوگا۔" چائے کا خالی کپ ہاتھ میں لے کر نکلتے نکلتے وہ اقصیٰ کو نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔ اقصیٰ کے سامنے رکھی ٹرے اس نے نہیں اٹھائی تھی کہ پڑھنے کے دوران وہ تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ منہ میں بھی ڈالتی رہے۔

☆ ☆ ☆

"خالہ جان! دیکھیں' یہ حسن بھائی میری بات نہیں مان رہے۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے میری دوست کے گھر لے چلیں لیکن یہ سن کر ہی نہیں دے رہے۔" وہ شکایت لے کر امینہ بیگم کے پاس آئی۔

"امی! آپ اسے سمجھائیں کہ یہ روز روز مجھے ڈرائیور بنا کر اپنی دوستوں کے گھر نہ لے جایا کرے۔ اچھا خاصا عزت والا بندہ ہوں میں لیکن اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے مجھے اپنا شوفر بنا کر رکھ دیا ہے۔" حسن جوابی شکوہ پیش کیا۔

"مجھے کوئی شوق تھوڑا ہی ہے دوستوں کے گھر جانے کا۔ کسی نہ کسی کام سے ہی جاتی ہوں۔ آج بھی میرے فزکس

کے نوٹس امیمہ کے پاس رہ گئے' انہیں لینے جانا ہے۔" اقصیٰ نے اپنی صفائی پیش کی۔

"لے جاؤ نا حسن! کیوں تنگ کر رہے ہو میری بچی کو۔ پتہ بھی ہے اس کے امتحان چل رہے ہیں' اسے تیاری کرنی ہوگی۔" امینہ بیگم نے حسبِ معمول اقصیٰ کی حمایت کی۔

"امی نے کہا ہے' اب تو ماننا ہی پڑے گا۔ جاؤ جا کر میرے کمرے سے گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔" حسن نے منہ بناتے ہوئے کہا تو وہ فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھتی ہوئے باہر نکل گئی۔

"یہ زیادتی ہے امینہ! ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو بچہ آفس سے تھکا ہوا آیا ہے اور تم ذرا سی لڑکی کے کہنے پر اسے ایک بار پھر دوڑ لگوا رہی ہو۔"

امینہ بیگم کی دونوں نندیں ان کی مزاج پرسی کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ مکرم علی نے فون پر انہیں امینہ بیگم کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ اب چاہے بھاوج سے دلچسپی ہو یا نہ ہو بھائی کی خاطر تو انہیں آنا ہی تھا۔ وہ کافی دیر سے یہاں آئی ہوئی تھیں اور اقصیٰ کو گھر میں چہکتے اور مالکانہ انداز میں گھومتے پھرتے دیکھ کر حسبِ معمول دل ہی دل میں کلس رہی تھیں۔ اب جو انہوں نے دیکھا کہ حسن کی مرضی کے بغیر امینہ بیگم اسے اقصیٰ کے ساتھ اس کی دوست کے گھر بھیج رہی ہیں تو بڑی نند نصرت نے امینہ بیگم کو ٹوک ہی دیا۔

"ارے نہیں پھپھو! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل بھی تھکا ہوا نہیں ہوں۔ یہ تو بس اقصیٰ کو تنگ کرنے کے لیے جھوٹ موٹ بہانے بنا رہا تھا۔" امینہ بیگم سے پہلے حسن نے اپنی پھپھو کی تسلی کروائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ندا نہیں آئی تمہاری طبیعت کی خرابی کا سن کر؟" بھتیجے کے جواب نے مزید اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی' اس لیے نصرت نے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔

"اسے تو ہم نے اطلاع ہی نہیں دی۔ خوامخواہ پریشان ہو کر یہاں دوڑی آتی ہے اور اس کا اپنا گھر ڈسٹرب ہوتا ہے۔ مجھے یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگتی' اس لیے سب سے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ اگر میری طبیعت خراب ہو تو ندا کو نہ بتایا جائے۔" امینہ بیگم نے ندا کے نہ آنے کی وجہ بتائی۔

"مگر ان بی یہاں بھی تو ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم یوں بستر سے لگی ہو تو گھر کے تو دس کام رک گئے ہوں گے۔ ندا آجاتی تو سہارا رہتا۔" نصرت سے چھوٹی عصمت نے جیسے ان کی توجیہہ قبول نہیں کی۔

"ارے نہیں آپا! ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ اقصیٰ دیکھ لیتی ہے سب کچھ' اور میں بھی کوئی مہینہ بھر کے لیے تو بستر سنبھال کر نہیں بیٹھ جاؤں گی۔ دمے کا یہ اٹیک تو برسوں سے میری جان کو ساتھ لگا ہے۔ اب تو عادی ہو گئی ہوں اس کی۔ دو چار دن آرام کروں گی تو پھر پہلے کی طرح اٹھ کھڑی ہوں گی۔" امینہ بیگم نے ایک بار پھر وضاحت دی جو یقیناً نندوں کو پسند نہیں آئی۔

"اقصیٰ کا تو بچپنا ہی ختم نہیں ہوتا' گھر کیا خاک سنبھالیں گی۔ ہم نے تو جب بھی دیکھا' پڑھائی اور دوستوں میں ہی مصروف نظر آئیں۔" نصرت کے انداز میں اقصیٰ کے لیے واضح ناپسندیدگی تھی۔

امینہ بیگم خود بھی یہ بات جانتی تھیں کہ ان کی نندوں کو اقصیٰ کا اس گھر میں رہنا پسند نہیں۔ زرینہ جب اقصیٰ کے ساتھ اس گھر میں لوٹی تھی' تب بھی دونوں بہنوں نے بہت اعتراض کیا تھا لیکن مکرم علی کچھ بیوی کی خاطر اور کچھ خوفِ خدا سے مجبور ہو کر زرینہ کو اپنے گھر میں رکھنے پر راضی ہو گئے تھے۔ اپنی اس شکست پر دونوں بہنیں بے حد چراغ پا ہوئی تھیں اور اسی لیے شاید اب تک ان کے دلوں میں اقصیٰ کے لیے بغض تھا۔

"اور یہ جو تم نے لڑکی کو شترِ بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ رکھا ہے' یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ کچھ نہیں تو گھر میں موجود جوان لڑکے کا ہی خیال کرو۔ انسان کو بہکتے کیا دیر لگتی ہے۔ کل کلاں کو کوئی گل کھل گیا تو سر پکڑ کر روؤ گی۔ ویسے بھی خون کی تاثیر بڑا رنگ دکھاتی ہے۔"

عصمت آرا نے صاف زرینہ پر طنز کیا تھا۔ ان کا نام عصمت تھا اور وہ بس اپنی ہی عصمت کو قائم رکھنے کی قائل تھیں۔ دوسرے کی عزت و عصمت کو خاک میں ملانے کا ہنر ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کے اس قسم کے رویوں کے سامنے امینہ بیگم نے ہمیشہ خاموشی ہی اختیار کی تھی۔ سو آج بھی اسی پر عمل پیرا رہیں۔

تھوڑی دیر میں مکرم علی بھی گھر چلے آئے تو دونوں بہنیں امینہ بیگم کی جان بخش کر بھائی کے ساتھ مصروف ہو گئیں۔ مکرم علی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کالج میں پڑھاتے

تھے۔ بہنوں کی عادات اور انداز گفتگو ان کی طبیعت سے میل نہ کھانے کے باوجود وہ بڑی وضع داری سے ان سے اپنا رشتہ نبھا رہے تھے۔ ماں، باپ کے بعد مکرم علی کا گھر ہی ان دونوں کے میکے کی حیثیت رکھتا تھا اور مکرم علی نے ان کا یہ مان کبھی ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ البتہ ان کی شر پسند باتوں کو وہ ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔ بھائی بہنوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ اقصیٰ اور حسن واپس آگئے۔ حسن تو ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا جبکہ اقصیٰ کچن میں چلی گئی۔

"چلیں بھئی، کھانا لگ گیا ہے۔ سب لوگ آکر کھانا کھالیں۔"

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد اس نے آواز لگائی تو سب لوگ اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئے۔ ٹیبل پر موجود لوازمات دیکھ کر نصرت اور عصمت چونک گئیں۔ دال چاول، روٹی، سلاد، فرائیڈ فش اور چکن کڑاہی سے سجی ٹیبل اس بات کا ثبوت تھی کہ ان کا اقصیٰ کے بارے میں اندازہ غلط ہے۔ دونوں بہنیں خاموشی سے آکر بیٹھ گئیں۔ خیال تھا کہ کھانے میں مین میخ نکالیں گی لیکن جب کھانے بیٹھیں تو گرما گرم خستہ مچھلی، ذائقے دار چکن کڑاہی اور ان کے ساتھ موجود رائتہ سلاد نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ شرما حضوری میں انہوں نے دال چاول بھی چکھے۔ ذائقے کا اندازہ اس لیے نہیں لگا سکیں کہ اس کے ساتھ چکن کڑاہی کو خوب اچھی طرح مکس کرکے کھایا گیا تھا۔

کھانے کے بعد مکرم علی خود دونوں بہنوں کو ان کے گھر ڈراپ کرنے گئے۔ اتفاق سے دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں بیاہی تھیں اور اب جبکہ دونوں ہی پوتے پوتیوں والی تھیں، تب بھی دونوں کا اتحاد مثالی تھا۔ ضرورت کے مطابق انہوں نے اپنے گھر تو ضرور الگ کیے لیکن اس طرح کہ دیوار سے دیوار جڑی تھی، سو علیحدگی بس نام کو ہی تھی۔

"تھینک یو حسن بھائی!" دونوں کی روانگی کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے اقصیٰ نے حسن سے کہا۔ آج کھانے پر اس نے صرف دال چاول اور سلاد ہی بنایا تھا لیکن امیمہ کے گھر سے واپس آتے ہوئے حسن نے ایک اچھے ریسٹورنٹ سے پھپھیوں کے مزاج کے مطابق کھانا پیک کروالیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اقصیٰ کی امور خانہ داری ابھی بہت ابتدائی مراحل میں ہے۔ وہ گنتی کے چند سادہ سے کھانے بنانا ہی جانتی ہے جن کے سہارے وہ لوگ تو مشکل کے یہ چند دن گزار لیتے تھے لیکن پھپھیوں کی مہمانداری کے لیے یہ قابلیت بہت کم تھی۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ شکر تو اصل میں، میں ادا کررہا ہوں کہ پھپھیوں کی مہمانداری کے بہانے ہی سہی آج مجھے تمہارے ہاتھ کا کھانا کھانے سے نجات مل گئی۔" وہ بولتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے اقصیٰ کے ساتھ برتن سمیٹنے میں مدد دے رہا تھا۔ مقصد بس اتنا تھا کہ وہ جلد از جلد فارغ ہوجائے تاکہ اپنی پڑھائی کو وقت دے سکے۔

"اس وقت آپ کچھ بھی کہہ لیں، میں برا نہیں مانوں گی۔ آج سچ مچ آپ نے میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔"

اقصیٰ حسب عادت اپنے پکائے گئے کھانے پر دیے گئے کمنٹس پر واویلا مچانے کے بجائے ممنونیت سے بولی تو حسن اس کے اتنے معصوم انداز پر بے ساختہ مسکرا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"اچھا خالہ جان! میں کالج جارہی ہوں۔ اللہ حافظ۔" سفید کالج یونیفارم میں سرمئی پٹی والا سفید دوپٹہ سلیقے سے سر پر اوڑھے وہ کالج جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ بس جانے سے پہلے حسب معمول امینہ بیگم سے پیار لینے آئی تھی۔

"اللہ حافظ بیٹا! خیر سے جاؤ، خیر سے آؤ۔" امینہ بیگم نے اس کا ماتھا چوم کر دعا دی۔

"ابھی جاؤ اقصیٰ! ورنہ بعد میں شور مچاؤ گی کہ وقت پر کالج نہیں پہنچایا۔" باہر سے حسن نے اسے آواز دی تو وہ اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

"آج تمہارا آخری پیپر ہے نا؟" حسن نے اس کے بیٹھنے کے بعد گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، آپ خوش ہوجائیں کہ اب آپ کو کافی دن تک مجھے کالج چھوڑنے کی ڈیوٹی نہیں نبھانی پڑے گی۔ اب بس مجھے ان ایگزامز کا رزلٹ اور ایڈمٹ کارڈ لینے ہی ایک بار کالج جانا پڑے گا۔ اس کے بعد تو فائنل ایگزامز شروع ہوجائیں گے۔" اقصیٰ نے اس کو تسلی دینے والے انداز میں ساری تفصیل بتائی۔

"پاگل ہو تم، میں کبھی کبھار تمہیں چھیڑنے کے لیے کچھ کہہ دیتا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز بھی یہ نہیں ہے کہ مجھے تمہارے کام کرنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ تم نے امی کو ہی نہیں، ہم سب کو عزیز ہو اور جو لوگ عزیز ہوں، ان کے کام تو انسان خوشی سے کرتا ہے۔" حسن اس وقت سنجیدہ موڈ میں تھا۔

"چلیں اچھا ہے آپ نے میری تسلی کروادی۔ ابھی میں آپ کو ایک کام بتانے ہی لگی تھی۔" اس کی بات سن کر اقصیٰ نے شوخی سے کہا۔

"مارے گئے۔ یعنی غلط وقت پر ڈائیلاگ بول دیا۔" حسن نے چہرے پر بے چارگی طاری کرتے ہوئے کہا تو اقصیٰ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"آج آفس سے واپسی میں ندا باجی کو ان کے گھر سے لے آئیے گا۔ کل رات میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میرے فائنل ایگزامز سے پہلے ایک بار بچوں کے ساتھ رہنے کے لیے آجائیں، ورنہ پھر بعد میں، میں بزی ہوجاؤں گی تو سب کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرنے کا ٹائم نہیں ملے گا۔ تو وہ کہنے لگیں کہ آج کل عامر بھائی مصروف بہت ہیں اور انہیں چھوڑنے نہیں آسکتے۔ میں نے کہا۔ کوئی بات نہیں، حسن بھائی آپ کو لینے آجائیں گے۔ میں نے ٹھیک کہا نا حسن بھائی؟ آپ چلے جائیں گے نا ندا باجی کو لینے؟"

ساری تفصیل سناتے ہوئے آخر میں بہت معصومیت کے ساتھ پوچھا گیا۔ حسن کے پاس ہاں کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"ندا باجی آئیں گی تو تب ہی انہیں خالہ جان کی طبیعت بگڑنے کے بارے میں بھی بتادیں گے۔ نا بتانے پر وہ ناراض تو ہوں گی لیکن ہم چپ کرکے ان کی ناراضی برداشت کرلیں گے۔ خوامخواہ وہ پریشان ہوتیں، اس کے مقابلے میں ان کی تھوڑی دیر کی ناراضی بہتر ہے۔"

اب وہ ندا کے آنے کے بعد کا پروگرام سیٹ کررہی تھی، جبکہ حسن صرف مسکراتے ہوئے سن رہا تھا۔

"یہ آپ اتنا مسکرا کیوں رہے ہیں؟" وہ شک بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ تو وہ ہنس پڑا۔

"میں سمجھ گئی۔ آپ اس لیے خوش ہورہے ہیں کہ ندا باجی اپنے ساتھ حسیناؤں کی تصویروں کا اسٹاک بھی لائیں گی، جن میں سے شاید کوئی ایک آپ کے دل کو بھا جائے۔"

اس کی بات حسن کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ جواباً" اقصیٰ نے اسے ناراضی سے گھورا اور پھر منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں نے کباب، کوفتے اور دو تین مزید چیزیں بنا کر فریز کردیے ہیں۔ ہلکا پھلکا کھانا تو اقصیٰ بنا ہی لیتی ہے۔ بس آپ اتنی مہربانی کیجیے گا کہ مزید کچھ دن کچن کا رخ نہ کریں۔ میں خود بھی کوشش کروں گی کہ دس پندرہ دن بعد دوبارہ چکر لگا سکوں۔"

ندا چار دن سے میکے میں تھی، پہلے تو وہ اس بات پر ہی خوب ناراض ہوئی کہ اسے امی کی بیماری کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔ سب لوگوں نے سمجھا بجھا کر اس کی ناراضی کو دور کیا تو اسے دوسری فکر لاحق ہوگئی کہ امینہ بیگم جواب کافی حد تک سنبھل چکی تھیں۔ کہیں کچن کے کاموں میں نہ الجھ جائیں، اس لیے ان چار دنوں میں وہ وقتاً" فوقتاً" کچھ نہ کچھ بنا کر فریزر میں اسٹور کرتی رہی تھی اور جب آج اس کے یہاں قیام کا آخری دن تھا تو امینہ بیگم کو ہر تھوڑی دیر بعد آرام، احتیاط اور پرہیز سے متعلق کوئی نہ کوئی ہدایت دیتی جارہی تھی۔ امینہ بیگم مسکراتے ہوئے بیٹی کی یہ محبت میں ڈوبی ہدایتیں سنتی رہی تھیں۔

"حسن! اب تم بھی فٹافٹ کسی لڑکی کے لیے ہاں کردو، ورنہ میں خود ہی اپنی مرضی سے کسی جگہ تمہارا رشتہ طے کردوں گی۔ اب تمہارے نخرے سہنے کا وقت نہیں ہے۔ ایک تو تمہاری عمر نکلی جارہی ہے، دوسرے امی کو بھی ایک ہیلپر کی ضرورت ہے۔"

آج حسن کا ہاف ڈے تھا اس لیے وہ گھر جلدی آگیا تھا۔ ندا نے لگے ہاتھوں اس کی بھی کلاس لے ڈالی۔

"اقصیٰ کرتی تو ہے امی کی ہیلپ۔" حسن نے بودی سی دلیل دی۔

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ نہیں کرتی لیکن ایک تو اس پر پڑھائی کا بوجھ ہے، دوسرے وہ ابھی خود کم عمر اور ناسمجھ ہے۔ گھر سنبھالنے کے لیے اقصیٰ کی نہیں، کسی سمجھ دار لڑکی کی ضرورت ہے۔" ندا آج کسی دلیل کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"اچھا بعد میں دیکھیں گے اس معاملے کو۔ ابھی تو میں تھوڑی دیر ریسٹ کرنے اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ آپ کو شام میں پانچ چھ بجے تک آپ کے سسرال چھوڑ آؤں گا۔"

حسن نے وہاں سے فرار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔

کمرے میں جا کر اس نے پوری رفتار سے پنکھا چلایا اور بستر پر لیٹ کر لمحوں میں غافل ہو گیا۔ پچھلے چند دنوں سے کام کی زیادتی اور امینہ بیگم کی طبیعت کی وجہ سے اس پر اتنا بوجھ رہا تھا کہ وہ ڈھنگ سے سو نہیں پا رہا تھا۔ اب بھی اسے سوتے ہوئے مشکل سے آدھا پون گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ کسی نے بری طرح جھنجوڑ کر اسے جگایا۔

"حسن.... اٹھو' دیکھو امی کو پھر اٹیک ہوا ہے۔" وہ ندا تھی جو آنکھوں میں آنسو لیے حواس باختہ اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ حسن کے سوئے ہوئے ذہن کو صورت حال سمجھنے میں چند سیکنڈ ہی لگے۔ وہ تیزی سے اٹھ کر نیچے کی طرف بھاگا۔ امینہ بیگم کے کمرے میں اقصیٰ انہیلر کی مدد سے ان کی سانس بحال کرنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی تھی لیکن ان کی حالت سے ظاہر تھا کہ انہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔

"گاڑی کی چابی لاؤ اقصیٰ...." حسن چلایا اور امی کو بازوؤں میں اٹھا کر باہر کی طرف بھاگا۔

"اقصیٰ پلیز تم بچوں کے پاس رک جاؤ۔ میں امی کے ساتھ ہسپتال جاؤں گی۔" اقصیٰ چابی لے کر آئی تو ندا نے لجاجت سے کہا۔ وہ راضی ہو گئی۔ مکرم علی بھی اس وقت اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے اور بچوں کو تنہا گھر میں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

وہ تینوں بچوں کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ کر دعائیں کرتی رہی۔ آٹھ سالہ یاسر قدرے سمجھ دار تھا اور ماحول کی گمبھیرتا کو سمجھ رہا تھا' اس لیے چپ چاپ ایک طرف سنجیدگی سے بیٹھ گیا تھا۔ اس سے چھوٹی عمارہ کی اپنی ہی دنیا تھی۔ وہ اپنی گڑیا کے ساتھ اس کا گھر سجانے کھیلنے میں مصروف تھی جبکہ سب سے چھوٹے تین سالہ اظفر کو اس نے اپنی گود میں لٹا لیا تھا جو اس کی مسلسل تھپکیوں سے تھوڑی دیر میں سو چکا تھا۔ اقصیٰ کبھی اپنے آنسو صاف کرتی اور کبھی بے چین نظروں سے فون کی طرف دیکھتی۔ کئی دفعہ اس نے حسن کے موبائل پر بھی ٹرائی کیا تھا لیکن وہ بھی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس صورت حال پر وہ بری طرح سہم کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا جب گھر کے سامنے کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تو گود میں سوئے ہوئے اظفر کو صوفے پر لٹا کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ اس اثنا میں ڈور بیل بھی بج چکی تھی۔ اقصیٰ نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ سامنے حسن کھڑا تھا۔

"خالہ جان کیسی....." حسن کو دیکھ کر اس نے تیزی سے سوال کرنا چاہا لیکن اس کے پیچھے نظر آتے منظر نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی۔ حسن کی گاڑی کے ساتھ ہی ایک ایمبولنس کھڑی تھی جس میں سے سفید چادر سے ڈھکا ایک وجود باہر نکالا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی زارو قطار روتی' نڈھال سی ندا بھی موجود تھی۔ اب کسی سوال کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اقصیٰ کے سامنے زمین و آسمان کے بیچ موجود ہر چیز گردش کرنے لگی۔ اس سے قبل کہ وہ اس گھومتی ہوئی زمین کے ساتھ اپنا توازن کھو بیٹھتی دو ہاتھوں نے اس کے وجود کو سنبھال لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"انکل! آپ اجازت دیں تو آج میں ندا کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤں۔ اصل میں امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

آج امینہ بیگم کے انتقال کو چھٹا دن تھا۔ اچانک پہنچنے والے صدمے سے نڈھال ہو جانے والے اہل خانہ اب کچھ کچھ سنبھلنے لگے تھے۔ اپنی والدہ کی طرف سے پریشان عامر نے بہت جھجکتے ہوئے مکرم علی کے سامنے اپنا مدعا پیش کیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جو تم مناسب سمجھو۔ یوں بھی ندا پر اب ہم سے زیادہ تمہارا حق ہے پھر بچوں کی بھی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ اچھا ہے اپنے گھر چلے جائیں گے تو ان کی زندگی بھی معمول پر آجائے گی۔"

مکرم علی نے بجھے بجھے انداز میں جواب دیا۔ شریک حیات کی جدائی کے یہ دن بہت کٹھن تھے۔ بیٹی کی دلجوئی اس حال میں بہت سہارا دیتی تھی لیکن وہ اس حقیقت سے بھی نظریں نہیں چرا سکتے تھے کہ ندا کو آج نہیں تو کل اپنے سسرال لوٹنا ہی ہے۔ تو بہتر یہی تھا کہ وہ وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق آج ہی چلی جائے۔

"میرے خیال میں تو یہ کچھ مناسب نہیں۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ ایسے میں اگر ندا چلی گئی تو کون سارا انتظام دیکھے گا؟" بل بل کر کھجور کی گٹھلیاں پر کلمہ پڑھتی عصمت نے مکرم علی کو اجازت دیتے دیکھ کر دخل دیا۔

"میں کوشش کروں گا پھپھو کہ ندا کو روزانہ کچھ دیر کے لیے یہاں لے آؤں۔ ویک اینڈ پر میں اسے رکنے کے لیے چھوڑ دوں گا۔ چھٹی والے دن میں خود گھر پر رہ کر امی کو دیکھ سکتا ہوں۔ اصل میں سارا مسئلہ ہی امی کی طبیعت کا ہے' ورنہ مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا کہ ایسے وقت میں جبکہ ندا کی یہاں ضرورت ہے' میں اسے واپس لے جانے کی بات کر رہا ہوں۔" عامر جو پہلے ہی شرمسار تھا' نادم سا وضاحتیں دینے لگا جسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے عصمت نے زور کی "ہونہہ" کی اور رخ پھیر کر دوبارہ خضوع و خشوع سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

"تم ٹینشن مت لو بیٹا! میں معاملے کی نوعیت سمجھ رہا ہوں' اس لیے پورے دل سے تمہیں ندا کو لے جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ رہی روزانہ اسے یہاں لانے کی بات تو میرے خیال میں یہ کچھ ایسا ضروری نہیں۔ تم تھکے ہارے آفس سے آکر روزانہ اتنی لمبی ڈرائیو کی مشقت اٹھاؤ یہ زیادتی ہے۔ بس تم اپنی سہولت سے ویک اینڈ پر ندا کو یہاں چھوڑ جانا۔" بہن کے تاثرات کا اثر زائل کرنے کے لیے مکرم علی داماد کے ساتھ کچھ اور نرم ہو گئے۔

"یہ کس کے آنے جانے کی بات ہو رہی ہے بھئی؟" نصرت جو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں' ادھوری گفتگو سن کر پوچھنے لگیں۔

"ندا کا ذکر ہے۔ خیر سے عامر میاں' بیوی کو واپس لے جانا چاہتے ہیں اور ہمارے بھائی صاحب نے اجازت بھی دے دی ہے۔" عصمت آرا نے فوری طور پر بہن کو اطلاع دی' وہاں ردعمل حسب توقع تھا۔

"ہیں.... یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ندا چلی گئی تو یہاں کے معاملات کون دیکھے گا۔" انہوں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"یہاں کی کیا فکر ہے آپا! آپ اور چھوٹی آپا ہیں نا۔ مجھے تسلی ہے آپ دونوں مل کر سب کچھ دیکھ لیں گی۔" مکرم علی کو داماد اور بہنوں دونوں کی خوشنودی مطلوب تھی' اس لیے تدبر سے بات ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے' تمہاری خاطر ہم یہاں رک بھی جائیں گے اور اپنی ہمت کے مطابق گھر بھی دیکھ لیں گے لیکن گھر کے بارے میں گھر کی بیٹی ہی زیادہ مناسب جان سکتی ہے۔ کون سی چیز کہاں ہے؟ کتنی ہے؟ آنے جانے والوں کی تواضع کا کیا انتظام ہے؟ ہمیں بھلا کیسے ان باتوں کی خبر ہو سکتی ہے؟" نصرت بالکل ایسے پریشانی کا اظہار کر رہی تھیں' جیسے یہ میت کا گھر نہ ہو بلکہ گھر کے دروازے پر عنقریب کوئی بارات اترنے والی ہو جس کی خاطر مدارت اچانک ان کے سر پر آپڑی ہو۔ مکرم علی کو ان کے اس انداز پر چڑ سی ہوئی لیکن اپنا ہمیشہ والا تحمل برقرار رکھتے ہوئے بولے۔

"ان سب باتوں کے لیے آپ پریشان نہ ہوں۔ اقصیٰ موجود ہے گھر میں اور ندا سے بہتر طور پر ہر بات جانتی ہے۔"

"اقصیٰ کا بھی خوب ذکر نکالا تم نے۔ میں پوچھنے ہی والی تھی اس کے بارے میں بھی کہ اب اس کا کیا ہو گا؟ امینہ تو رہی نہیں جو اب اس کی بھانجی اس گھر میں رہ سکے۔" نصرت نے یکدم ہی موضوع بدل دیا لیکن ان کی بات ایسی تھی کہ متحمل مزاج مکرم علی بھی طیش میں آگئے اور بولے۔

"اقصیٰ کی فکر نہ کریں۔ اقصیٰ کل بھی اس گھر میں رہتی تھی اور آئندہ بھی یہیں رہے گی۔ امینہ کے چلے جانے سے اس کا اس گھر سے حق ختم نہیں ہو گیا۔ وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور جب تک وہ ندا کی طرح اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی' اسے یہیں رہنا ہے۔ امینہ کے بعد میں اس کی یتیم بھانجی کو اپنے گھر سے نکال دوں گا' یہ تو کوئی بھول کر بھی نہیں سوچے۔" مکرم علی کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ نصرت ان کے اس انداز پر دبک گئیں لیکن ایسے وقت میں عصمت ان کی مدد کو آگے بڑھیں۔

"تم معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہے مکرم! بے شک تمہارے نزدیک اقصیٰ تمہاری بیٹی جیسی ہے لیکن وہ سچ مچ تو تمہاری بیٹی نہیں پھر اس گھر میں حسن بھی رہتا ہے۔ دو نامحرم افراد کے درمیان اس لڑکی کا یہاں رہنا بالکل نامناسب ہے۔"

"کہہ تو ٹھیک رہی ہیں پھپھو!" عامر جس کی مخالفت کے نتیجے میں یہ ساری گفتگو نکلی تھی' ان کی حمایت میں بولا۔ نکتہ ایسا تھا کہ مکرم علی بھی کچھ دیر کے لیے چپ ہو کر سوچوں میں ڈوب گئے۔

"ندا بیٹا! یہاں آؤ۔ بات سنو۔" سوچ کی گہرائی سے نکل کر انہوں نے بلند آواز میں ندا کو پکارا۔

"جی ابو! خیریت تو ہے؟" ذرا ہی دیر میں ندا ان کے سامنے تھی۔

"ہاں بیٹا! سب خیریت ہے۔ میں نے تمہیں یہ کہنے کے لیے بلایا تھا کہ آج بلکہ ابھی کچھ دیر میں اقصیٰ اور حسن کا نکاح ہونے والا ہے۔ تم دونوں کو اطلاع دے دو تاکہ وہ

قاضی صاحب کے آنے تک خود کو ذہنی طور پر تیار کر سکیں۔" مکرم علی بہت فیصلہ کن انداز میں کہہ رہے تھے۔

"حسن اور اقصیٰ کا نکاح..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابو؟" ندا ان کی بات سن کر شدید ترین حیرانی کا شکار تھی۔

"انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ندا! تم میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔" عامر' ندا کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر لے گیا۔

"بات تو خیر صحیح ہے لیکن معلوم نہیں حسن راضی ہوگا یا نہیں پھر اقصیٰ کا بھی مسئلہ ہے۔ وہ تو ابھی تک امی کی ڈیتھ کو بھی قبول نہیں کرپائی ہے۔ ایسے میں حسن سے نکاح اس کے لیے ایک اور شاک ثابت ہوسکتا ہے۔" ندا' عامر کی زبانی ساری بات سن کر فکر مندی سے بولی۔

"حسن اور اقصیٰ کو حالات کی نزاکت سمجھانا تمہارا کام ہے۔ ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ کوئی اور نہیں ہوسکتا پھر میں انکل کا موڈ بھی دیکھ رہا ہوں۔ اگر اس وقت کسی نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کیا تو وہ اس انکار کو قبول نہیں کریں گے۔" عامر نے ندا کو موقع کی نزاکت کا احساس دلایا تو وہ کچھ اور فکر مند ہوگئی۔

"اس طرح پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جاؤ اور جاکر حسن اور اقصیٰ سے بات کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ انکل نکاح کے انتظامات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔" عامر اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے واپس پلٹ گیا تو ندا بھی ناچار حسن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حسن اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا' ندا کو کمرے میں آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟" حسن نے ندا کے چہرے پر چھائی پریشانی کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔" ندا نے کہا اور بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ حسن سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر ندا نے آہستہ آہستہ عامر کی زبانی سنی جانے والی دونوں پھپھیوں کی گفتگو کے بارے میں بتانا شروع کیا جسے سن کر حسن کے چہرے پر غصے کی سرخی چھا گئی۔ البتہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر خاموشی سے سنتا رہا لیکن جب ندا نے اس گفتگو کے نتیجے میں کیے گئے مکرم علی کے فیصلے کے بارے میں بتایا تو اس کی خاموشی برقرار نہیں رہ سکی۔

"یہ کیسا فیصلہ کیا ہے ابو نے؟ لوگوں کی باتوں میں آکر اس طرح کا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ابو کو میرے اور اقصیٰ کے درمیان موجود عمر کا فرق تو دیکھنا چاہیے تھا۔ میں ہرگز اقصیٰ کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا غصے سے برا حال تھا۔

"زیادتی کی کیا بات ہے حسن! تم ہر طرح بہترین ہو۔ کسی لڑکی کا رشتہ طے کرتے وقت لڑکے میں جو خصوصیات دیکھی جاتی ہیں' ماشاء اللہ سے تم میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں۔ رہی عمر کے فرق کی بات تو دس گیارہ سال کا فرق کوئی اتنا زیادہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں تو اس طرح کی شادیاں عام ہیں۔" ندا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جو بھی ہو لیکن شادی کوئی بچوں کا کھیل نہیں جس کا فیصلہ یوں کھڑے کھڑے کردیا جائے۔ میں خود بات کرتا ہوں ابو سے اس سلسلے میں۔" حسن تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ندا بھی پریشان سی اس کے پیچھے بھاگی۔ اس وقت اسے شدت سے رونا آرہا تھا' وہ گھر جسے امینہ بیگم نے بہت محنت سے سمیٹ کر رکھا ہوا تھا' ان کے جاتے ہی مسائل کا شکار ہونے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم کیا حماقت کررہے ہو مکرم! کیا بیوی کی موت نے صدمے سے تمہارا دماغ الٹ دیا ہے۔" ادھر نصرت' بھائی کو ڈپٹ رہی تھیں' مکرم علی کے فیصلے نے تو انہیں سلگا کر ہی رکھ دیا تھا۔ وہ لڑکی جس کا بھائی کے گھر میں رہنا انہیں ہمیشہ کھٹکتا تھا' اس گھر کی مالکن ہی بن جاتی یہ وہ کیسے گوارا کرتیں' اس لیے اب اس کوشش میں تھیں کہ کسی طرح مکرم علی کا فیصلہ بدلا جاسکے۔

"حماقت کی کیا بات ہے۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک اہم مسئلے کی طرف میری توجہ مبذول کروائی۔ آج اگر آپ نہ کہتیں تو کل نہ جانے کس کس کی زبانیں کھل جاتیں۔ میرے گھر میں' میری سرپرستی میں رہنے والی بچی کسی کی تہمت کا شکار ہوتی تو میں خود کو بھی معاف نہیں کرپاتا۔ اقصیٰ کو کسی تہمت سے بچانے کے لیے میرے فیصلے پر عمل ہونا بہت ضروری ہے۔" مکرم علی پوری طرح سنجیدہ تھے۔

"کیا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے اس "معصوم" کو بچانے کے لیے کہ تم اپنا بیٹا داؤ پر لگادو۔" نصرت نے جلبلا کر بولیں

"میرے پاس تو یہی طریقہ ہے' اگر آپ کے پاس اس سے بہتر کوئی حل ہے تو وہ بتا دیں۔"

"تم حسن کی کہیں اور شادی کردو' گھر میں دوسری عورت آجائے گی تو پھر لوگوں کی باتیں بنانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔" نصرت نے مشورہ دیا۔

"وہ دوسری عورت اقصیٰ کا وجود برداشت کرلے گی اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟ اگر الٹا اس نے ہی الزام تراشی شروع کردی تو ہم کیا کریں گے پھر دوسری بات یہ کہ اتنی ایمرجنسی میں ہم کوئی دوسری لڑکی کیسے تلاش کریں؟ کھڑے کھڑے تو کوئی اپنی بیٹی دینے پر راضی نہیں ہوگا۔" مکرم علی نے فوراً" ہی نصرت کا مشورہ رد کردیا تو وہ مدد طلب نظروں سے چھوٹی بہن کی طرف دیکھنے لگیں۔ اسی پل غم و غصے میں مبتلا حسن کمرے میں داخل ہوا۔

"سب چھوڑو پہلے بیٹے سے تو پوچھ لو کہ اسے اقصیٰ کو اپنی بیوی بنانا منظور ہے یا نہیں۔ یہ نہ ہو کہ پرائی لڑکی کی بھلائی کی خاطر اپنے بیٹے سے ہی زیادتی کر بیٹھو۔"

عصمت کی زیرک نگاہوں نے حسن کے بگڑے ہوئے تیور پہچان لیے تھے' اس لیے فوراً" بولیں۔ نجانے کیوں وہ بہنیں' اقصیٰ سے اس قدر خار کھاتی تھیں۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ مکرم علی کے گھر میں رہ کر اقصیٰ کو جو سہولیات حاصل ہیں' وہ اقصیٰ سے زیادہ ان کا اور ان کے بچوں کا حق ہیں جن پر اقصیٰ غاصب بن کر بیٹھی ہوئی ہے۔

"حسن میرا بیٹا ہے' میں جانتا ہوں میرا بیٹا میرا مان کبھی نہیں توڑے گا' اسی لیے میں اتنا بڑا فیصلہ اس سے پوچھے بغیر کرڈالا۔ اگر آپ کو پھر بھی کوئی شک ہے تو یہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ خود اس سے پوچھ لیں۔" مکرم علی نے اتنے پُریقین لہجے میں کہا کہ حسن جو بہت غصے میں یہاں آیا تھا' یکدم ہی ٹھنڈا پڑگیا پھر یوں بھی وہ پھپھیوں کی اقصیٰ کے لیے مخالفت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں کس طرح امینہ بیگم کو بھی اقصیٰ کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات کہہ کے ہرٹ کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت ان خواتین کی حمایت کا فائدہ اٹھانا اپنی ماں کی دل آزاری کرنے والوں کا ساتھ دینے کے برابر تھا۔ اور یہ کام وہ کبھی نہیں کرسکتا تھا' اس لیے بول اٹھا۔

"ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں' مجھے نہ صرف ان کا فیصلہ قبول ہے بلکہ یہ بھی یقین ہے کہ ان سے بڑھ کر میرے لیے کوئی بھی اچھا نہیں سوچ سکتا۔" اس نے ایک طرح سے پھپھیوں پر جتا دیا تھا کہ وہ ان کی ہمدردی کے جال میں آنے والا نہیں ہے۔ اس کے ان الفاظ نے جہاں ان دونوں کے منہ لٹکائے' وہیں حسن کے پیچھے کھڑی ندا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"ندا بیٹا! تم نے اقصیٰ سے بات کرلی؟" مکرم علی نے حسن کی طرف سے مطمئن ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ابو! ابھی کرتی ہوں۔" ندا پلٹنے لگی۔

"تم رہنے دو' میں خود بات کرتا ہوں آسی سے۔ تم ذرا آپا کے گھر فون کرکے وہاں سے سب لوگوں کو یہاں بلوالو۔ عامر قاضی وغیرہ کا انتظام کرنے گیا ہے۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی وہ باہر سے ہی سامان لے آئے گا' تم بس برتنوں وغیرہ کا ارینج منٹ دیکھ لو۔"

مکرم علی نے ہدایت کی تو وہ محض سرہلا کر رہ گئی۔ آج جبکہ ماں کو مرے صرف چھٹا دن تھا' وہ اکلوتے لاڈلے بھائی کی اس انداز میں شادی پر بہت دلبرداشتہ ہو رہی تھی لیکن یہی وقت کا تقاضا تھا۔ وقت کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مکرم علی بھی سرگرم تھے۔ غم سے نڈھال اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے اقصیٰ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"آجائیں۔" اندر سے اقصیٰ کی مدھم آواز سنائی دی تو وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ اقصیٰ قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹ رہی تھی۔ اس کی متورم آنکھیں گواہ تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔

"خالو جان آپ! اگر کوئی کام تھا تو مجھے بلوا لیا ہوتا۔" مکرم علی کو اپنے سامنے پاکر وہ حیران ہوئی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! کبھی کبھی بڑوں کو بھی بچوں کے سامنے آکر اپنی گزارش پیش کرنی پڑتی ہے۔" مکرم علی کے الفاظ نے اب کے اسے پریشان کردیا۔

"کیسی گزارش' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خالو جان؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"یہ بتاؤ اقصیٰ! تم مجھے اور اپنی خالہ جان کو اپنے ماں باپ کی جگہ سمجھتی ہو یا نہیں؟" اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"بالکل خالو جان! اس میں تو شک وشبے کی کوئی بات ہے ہی نہیں۔" اقصیٰ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پورے یقین و اعتماد سے کہا۔

"جیتی رہو۔ اگر میں کہوں کہ اسی رشتے کے مان سے میں تم سے تمہارے متعلق ایک فیصلہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں تو کیا تم مجھے یہ حق دوگی؟" مکرم علی کی باتیں اسے الجھا رہی تھیں۔

"بالکل خالو جان! بلکہ آپ کو مجھ سے یہ سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا' میرے کہے بغیر بھی آپ کو یہ حق حاصل ہے۔"

"تو بیٹا! میں نے اپنے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے تمہارا اور حسن کا رشتہ طے کردیا ہے۔ تھوڑی دیر میں نکاح خواں آئے گا تو تم دونوں کا نکاح ہوجائے گا۔ باقی کی کسر ہم کچھ دن بعد ولیمہ کرکے اس میں پوری کردیں گے۔ مجھے معلوم ہے لڑکیوں کو اپنی شادی کے حوالے سے بہت سے ارمان ہوتے ہیں لیکن اس وقت حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمیں سادگی سے ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ البتہ ولیمہ پر دھوم دھام کا میری طرف سے وعدہ ہے۔" اقصیٰ ہکا بکا سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر بھی نکل گئے۔

"ندا باجی! یہ خالو جان کیا کہہ گئے ہیں ابھی؟" مکرم علی کے باہر نکلتے ہی ندا اس کے کمرے میں آئی تھی جسے دیکھ کر اس کے منہ سے سرگوشی سی برآمد ہوئی تھی۔

"جو کچھ کہہ گئے ہیں' ٹھیک ہے۔ تم اٹھو اور فوراً" تیاری پکڑو۔ میں تمہارے کپڑے استری کرتی ہوں۔" ندا اس کی الماری کھولے کھڑی تھی۔ ذرا سی جدوجہد کے بعد اس نے گلابی رنگ کا مقیش کے کام والا سوٹ جو اقصیٰ نے نصرت پھپھو کی بیٹی کی شادی پر پہنا تھا' الماری سے دریافت کرلیا۔

"لیکن ندا باجی۔!" اقصیٰ اب بھی متذبذب سی کھڑی تھی۔

"لیکن ویکن کا ٹائم نہیں ہے۔ ابھی مجھے اور بھی بہت سے انتظامات دیکھنے ہیں۔" ندا نے جان بوجھ کر اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے غسل خانے کی طرف دھکیلا۔ اس وقت خود اس کے اپنے اعصاب چٹخ رہے تھے۔ ایسے میں اگر اقصیٰ اس کا آسرا پاکر بکھر جاتی تو اس کے لیے حالات سے نبٹنا مشکل ہوجاتا۔

☆ ☆ ☆

سوں' سوں کی آواز پر حسن نے ذرا سا رخ موڑ کر اپنے برابر بیٹھی اقصیٰ کو دیکھا۔ گلابی دوپٹہ جس کے کناروں پر پتلی سی سلور بیل لگی ہوئی تھی اوڑھے بیٹھی تھی اقصیٰ سے اس کے رشتے کی نوعیت بالکل اچانک ہی بدل گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ دونوں ایجاب و قبول کے مرحلے سے گزرے تھے۔ موقع پر موجود حسن کے کزنز اور ان کے بیوی بچے ان دونوں کو مبارک باد دینے کے بعد اب ان اشیاء سے انصاف کررہے تھے جو عامر تواضع کے لیے لے کر آیا تھا۔ ندا نے میزبانی کے فرائض سنبھال رکھے تھے۔ ایسے میں کسی کے پاس فرصت نہیں تھی کہ چپکے چپکے روتی اقصیٰ کی طرف توجہ دیتا۔ حسن نے کچھ بے چین ہوکر ایک بار پھر اقصیٰ کی طرف دیکھا۔ اس کی کل تیاری ہونٹوں پر لگی ہلکی سی گلابی لپ اسٹک پر مشتمل تھی۔ کانوں میں پہنے گئے چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور گلے میں موجود نازک سی چین جو امینہ بیگم نے اسے میٹرک میں پاس ہونے پر تحفے میں دی تھی اور جنہیں وہ ہمیشہ ہی پہنے رکھتی تھی۔ آج دلہن کی حیثیت میں بھی اس کا کل سنگھار تھے لیکن شاید اسے ان سب باتوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ فی الوقت تو وہ خود پر ٹوٹنے والی اس اچانک افتاد پر ہراساں پوری شدومد سے رونے میں مصروف تھی۔

اس کا یہ رونا حسن کو دکھ دے رہا تھا۔ ڈھائی سال کی عمر سے وہ ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک حسن سمیت سب ہی کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ اقصیٰ کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے پائیں۔ اس وقت بھی اس کے آنسوؤں نے حسن کے دل کو بری طرح دکھایا اور اس نے تسلی دینے والے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ گود میں دھرے اقصیٰ کے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر دبایا لیکن اقصیٰ کے ردعمل نے اسے شرمندہ کردیا۔ حسن کے ہاتھ رکھتے ہی اقصیٰ نے بہت تیزی سے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کرلیے تھے۔ یہ اس کا ردعمل تھا جو اپنا ہر آنسو اس کے شانے پر سر رکھ کر بہایا کرتی تھی۔

ندا کی شادی کو دس سال ہوگئے تھے اور حسن پورے دس سال سے اقصیٰ کے لیے ہر موقع پر اپنا شانہ مہیا کرتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ابھی چھ روز قبل ہونے والی اپنی ماں کی موت پر بھی اس نے جی جان سے اقصیٰ کی اشک شوئی کی تھی لیکن اب وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے اس طرح باہر نکلنے پر ندا کی توجہ اقصیٰ کی طرف مبذول ہوئی اور اسے

روتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔ اقصیٰ کے برابر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ نتیجتاً" اقصیٰ کے رونے میں کچھ اور بھی شدت آگئی۔ خود ندا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

"پاگل ہوئی ہو ندا! بجائے اسے چپ کروانے کے خود بھی رونے لگیں۔" اس کے ایک پھپھی زاد بھائی کی بیوی نے قریب آکر ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہوئے ندا کو سمجھایا لیکن بہت دیر سے ہمت کرکے کھڑی ندا کے ضبط کا بند حسن بھی اب ٹوٹ چکا تھا۔

"ہمت سے ندا! دیکھو اللہ نے غم کے فوراً" بعد تم لوگوں کو یہ خوشی دکھائی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔" ندا کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ اسے سمجھا رہی تھی۔

"میری امی..... بھابھی..... میری امی.....وہ تو اس خوشی کو دیکھنے کی حسرت اپنے دل میں لیے ہی اس دنیا سے چلی گئیں۔" ندا بری طرح بکھر رہی تھی۔ اقصیٰ کا رونا بھی مزید شدت اختیار کرگیا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ایک صوفے پر صبر کی تصویر بنے بیٹھے مکرم علی کو بالآخر اٹھ کر ان کے قریب آنا پڑا۔

"ندا..... میری بہادر بیٹی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" انہوں نے ندا کو اپنے بازو کے حصار میں لیا تو اسے اپناپن کچھ ٹھہرتا ہوا محسوس ہوا۔

"تم میرا سہارا ہو بیٹی! تم میری بڑی اولاد ہو اور بڑوں کی ذمہ داریاں بھی بڑی ہوتی ہیں' اس لیے انہیں اپنا ظرف بڑا رکھنا پڑتا ہے۔ تمہیں تو حسن کو بھی سنبھالنا ہے اور اقصیٰ کو بھی۔ رہی تمہاری ماں کے حسرت زدہ دنیا سے چلے جانے کی بات تو بیٹی! خوشیاں بھی رزق کی طرح انسان کا نصیب ہوتی ہیں جو خوشی تمہاری ماں کے نصیب میں دیکھنا نہیں لکھی تھی' اس کے لیے چاہے ہم ایڑی چوٹی کا بھی زور لگا لیتے تو ناکام ہی رہتے۔ اللہ کی رضا میں راضی رہنے کا نام ہی بندگی و اطاعت ہے بیٹا! یوں شکوہ کرکے مقام بندگی نہ کھوؤ۔" مکرم علی کی باتوں نے صرف ندا ہی کو نہیں' اقصیٰ کو بھی گریہ ترک کرنے پر مجبور کرا دیا تھا۔

"جاؤ' بہن کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر آؤ۔" ندا کو خود سے الگ کرتے ہوئے مکرم علی نے اسے ہدایت کی اور اقصیٰ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

"آؤ اقصیٰ آپا!" ندا' اقصیٰ کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے گئی۔

"فی الحال میں تمہیں تمہارے کمرے میں اس لیے لائی ہوں کہ تم ریلیکس ہو جاؤ اور میں تمہیں حالات کے بارے میں بھی باخبر کردوں۔" اقصیٰ کے کمرے میں پہنچ کر ندا نے اس سے کہا تو وہ نڈھال سی اپنے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ندا دھیرے دھیرے اسے اس ایمرجنسی نکاح کی وجوہات کے بارے میں آگاہ کرنے لگی۔ نکاح سے قبل وہ اقصیٰ کو یہ سب نہیں بتا سکی تھی' اس لیے اب بتا رہی تھی۔

"جو بھی ہوا جیسے بھی ہوا لیکن یہ تو طے ہے کہ اللہ نے تمہارا اور حسن کا جوڑ لکھ رکھا تھا' اسی لیے شاید حسن ابھی تک شادی پر راضی نہیں ہوا تھا کہ تمہیں اس کا نصیب بننا تھا۔ اب تم دونوں کو نصیب کے اس لکھے کو نبھانا ہے۔" ندا نے اپنی بات پوری کی تو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی اقصیٰ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ندا باجی! ایک بات کہوں۔"

"ہاں ہاں' بالکل۔" ندا نے اس کے تذبذب کو محسوس کرکے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"ابھی میں یہیں' اپنے کمرے میں ہی رہوں گی۔" نظریں جھکا کر اٹک اٹک کر اس نے جو بات کہی' ندا نے اسے اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھا۔ ندا کے ذہن میں ایسا کوئی خیال تھا تو نہیں لیکن اسے اقصیٰ کا مطالبہ ناجائز بھی محسوس نہیں ہوا۔ یقیناً" وہ ابھی ایک نئے رشتے کو نبھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ ندا نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"اچھی بات ہے۔ میں سب سے کہہ دوں گی کہ اقصیٰ کے فائنل امتحان ہونے والے ہیں' اس لیے فی الحال رخصتی نہیں کی جارہی۔ تمہارے امتحانوں کے بعد ہم باقاعدہ کوئی تقریب رکھ لیں گے' اس طرح جو کسر رہ گئی ہے' وہ بھی اس وقت پوری کرلی جائے گی۔"

"تھینک یو ندا باجی!" اقصیٰ نے ممنونیت سے کہا۔

"پاگل!" ندا نے پیار سے اقصیٰ کی ٹھوڑی کو چھوا اور باہر نکل گئی۔ پیچھے اقصیٰ سوچوں کے گرداب میں پھنسی بیٹھی تھی۔ حسن جسے اس نے ہمیشہ بڑے بھائی کا درجہ دیا تھا' اچانک ہی اس سے بدل جانے والا تعلق دل میں چبھن پیدا کررہا تھا تو دوسری طرف اسے شادی کے سلسلے میں کیے جانے والے حسن کے نخرے بھی یاد آرہے تھے۔ وہ شخص جو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی کو ایک نظر میں رد کردیتا تھا'

اس کے لیے اسے قبول کرنا یقیناً صرف مجبوری کا سودا تھا' وہ محض مجبوری اور مصلحت کے تحت حسن کی زندگی میں شامل کی گئی ہے' یہ خیال اقصیٰ کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈرائیونگ کی طرف توجہ مبذول ہونے کے باوجود حسن اپنے برابر میں بیٹھی اقصیٰ کے گریز کو محسوس کرسکتا تھا۔ یہ گریز اور فاصلہ ان کے نکاح کے بعد ہی قائم ہوگیا تھا۔ اس دن کے بعد سے اقصیٰ نے حسن کو از خود مخاطب کرنا ترک کردیا تھا۔ ندا کے اپنے گھر روانہ ہونے کے بعد اس نے گھر کی ذمہ داریاں اپنے ذمہ لے لی تھیں لیکن اس پر ایک چپ سی طاری تھی۔ خصوصاً" حسن کے معاملے میں یہ خاموشی شدید تھی۔ مکرم علی سے وہ ان کی ضروریات اور طبیعت کے متعلق پوچھتی رہتی تھی لیکن حسن سے مخاطب ہونا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا' البتہ وہ اس کی ضروریات کا خیال رکھ رہی تھی۔

حسن کو اپنے کپڑے پہلے ہی کی طرح دھلے دھلائے استری شدہ ملتے تھے' کھانا اور چائے بھی اپنے اوقات پر پیش کردیے جاتے تھے لیکن گریز ایسا تھا کہ حسن خود بھی اسے مخاطب نہیں کرپا رہا تھا۔ جواباً" اس نے بھی اقصیٰ جیسا رویہ اختیار کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اقصیٰ کے امتحان سر پر ہیں اور اتنے بڑے صدمے سے گزرنے کے بعد گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے اس کے لیے اپنی اسٹڈیز کو وقت دینا بہت مشکل ہوگا' اس لیے حسن نے ایک جزوقتی ملازمہ کا بندوبست کردیا تھا جس کے ہوتے ہوئے اقصیٰ کے ذمے صرف کھانا پکانے اور ملازمہ کی نگرانی کے کام رہ گئے تھے۔ ندا کی طرف سے بھی کافی تعاون کیا جارہا تھا۔ وہ ہر ویک اینڈ پر بچوں کے ساتھ رہنے آتی تو دو تین ڈشز بھی بنا کر فریز کردیتی' اس طرح اقصیٰ کا کام اور بھی ہلکا ہوجاتا تھا۔

ان لوگوں کے اس قدر تعاون کا ہی نتیجہ تھا کہ اقصیٰ امتحان دینے کے لائق ہوسکی تھی' اب تک اس کے جو پیپرز ہوئے تھے' وہ دینے کے لیے وہ مکرم علی کے ساتھ امتحانی مرکز جاتی رہی تھی۔ اس کی خواہش پر مکرم علی نے بہت خندہ پیشانی سے یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی لیکن آج آخری پیپر والے دن وہ اچانک ہی بیمار ہوگئے تھے' انہیں بخار تھا اور انہوں نے اقصیٰ کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری حسن پر ڈال دی تھی۔

"میں سوا بارہ بجے تک تمہیں لینے آؤں گا۔ تم یہیں گیٹ کے پاس میرا انتظار کرنا۔"

امتحانی مرکز کے سامنے اقصیٰ کو اتارتے ہوئے حسن نے کہا تو اقصیٰ کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ حسن اس کی اس بے رخی کو محسوس کرتے ہوئے خود بھی آفس روانہ ہوگیا۔ آفس میں کام کے دوران بھی اس کے ذہن میں مسلسل یہ بات رہی تھی کہ اسے ٹھیک وقت پر اقصیٰ کو لینے امتحانی مرکز پہنچنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ وقت پر اپنی سیٹ سے اٹھ گیا تھا۔ حالانکہ اس کی ٹیبل پر ایک بہت اہم نوعیت کا کام ادھورا پڑا ہوا تھا۔ سوا بارہ بجے وہ امتحانی مرکز کے سامنے پہنچا تو لڑکیوں کی کئی ٹولیاں گیٹ سے باہر نکل رہی تھیں۔ گیٹ کے آس پاس نظریں دوڑانے پر حسن کو ان لڑکیوں میں اقصیٰ کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ منتظر نظروں سے باہر آنے والی لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اندازہ تھا کہ اقصیٰ کو باہر نکلنے میں قدرے تاخیر ہوسکتی ہے۔

وہ پیپر دینے کے بعد پیپر کو اپنی دوستوں کے ساتھ ڈسکس کرنے کی عادی تھی۔ حسن اس کی یہ عادت جانتا تھا' اس لیے صبر سے انتظار کرتا رہا لیکن آہستہ آہستہ لڑکیوں کا رش چھٹ گیا اور چوکیدار نے بڑا گیٹ بند کرکے ذیلی دروازہ کھول دیا' تب حسن کو تشویش ہوئی۔ وہ گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے جناب؟" چوکیدار جو اسے بہت دیر سے دیکھ رہا تھا' اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یہاں میری کزن پیپر دینے آئی تھی' وہ ابھی تک باہر نہیں نکلی۔ تم اندر جا کر دیکھو' اقصیٰ نام کی لڑکی اندر موجود ہوگی۔ اس سے کہو کہ حسن علی اس کا انتظار کررہا ہے۔"

"اندر تو کوئی لڑکی نہیں۔ سارا کالج خالی ہوگیا ہے۔"

حسن کو جواب میں جو بات سننے کو ملی' وہ اس کے لیے غیر متوقع تھی۔

"میں بہت دیر سے یہاں کھڑا ہوں اور میرے سامنے وہ باہر نہیں نکلی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر ہی کہیں موجود ہے۔ تم ایک بار اندر جا کر چیک کرلو۔ شاید کوئی لڑکی اب بھی اندر موجود ہو۔" حسن نے اصرار کیا تو چوکیدار اندر چلا گیا۔

"جی جناب! کیا بات ہے۔ چوکیدار بتا رہا ہے کہ آپ اپنی کزن کی اندر موجودگی پر مصر ہیں۔ آپ کے کہنے پر اس نے ایک بار پھر ساری بلڈنگ چیک کرلی ہے لیکن اندر کوئی لڑکی موجود نہیں ہے۔"

چوکیدار دس منٹ بعد باہر آیا تو اس کے ساتھ پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک اور آدمی بھی موجود تھا جس کی بات نے حسن کو پریشانی میں مبتلا کردیا۔ اقصیٰ کبھی بھی خود سے کہیں آنے جانے کی عادی نہیں رہی تھی' اس لیے یہ سوچنا کہ وہ حسن کے آنے سے پہلے ہی اکیلی گھر چلی گئی تھی' مشکل تھا۔

"آپ گھر پر چیک کریں' ہوسکتا ہے آپ کی کزن اپنی کسی سہیلی کے ساتھ آپ کے آنے سے پہلے ہی گھر چلی گئی ہو۔"

اس آدمی نے حسن کی پریشانی دیکھتے ہوئے مشورہ دیا جو حسن کے دل کو لگا۔ واقعی یہ ممکن تھا کہ اقصیٰ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ گھر چلی گئی ہو۔ اس آدمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حسن گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے بھر اسے یہ اندیشہ ستاتا رہا کہ خدانخواستہ اگر اقصیٰ گھر پر نہیں ہوئی تو کیا ہوگا لیکن گھر پہنچ کر جیسے ہی اسے اقصیٰ کی شکل نظر آئی' اس کے سارے اندیشے ہوا ہوگئے اور اس کی جگہ شدید برہمی عود کر آئی۔

"تم گھر پہنچ چکی ہو اور میں پاگلوں کی طرح گھنٹہ بھر سے سینٹر کے سامنے کھڑا تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

"غصہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' تم وہاں دیر سے پہنچے ہوگے' اس لیے اقصیٰ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کے والد کی گاڑی میں گھر واپس آگئی ہے۔ اسے گھر پہنچے بہت دیر ہوچکی ہے اور تم جس ٹائم آئے ہو' اس سے ظاہر ہے کہ تم واقعی لیٹ ہوگئے تھے۔" مکرم علی' اقصیٰ کی مدد کو آئے۔

"میں نے اسے سوا بارہ بجے کا ٹائم دیا تھا اور میں ٹھیک سوا بارہ بجے کالج گیٹ پر موجود تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ دوست کے ساتھ آنے کے بجائے میرا انتظار کرتی۔" حسن نے ناراضی سے کہا۔

"اقصیٰ کا کہنا ہے کہ اس نے پونے بارہ بجے ہی پیپر ختم کرلیا تھا' اس لیے جب اس کی دوست نے اسے گھر ڈراپ کرنے کی آفر کی تو اس نے انتظار کرنے کے بجائے گھر واپس آنے کو ترجیح دی۔" مکرم علی نے وضاحت کی۔

اقصیٰ ان دونوں کو بحث کرتا چھوڑ کر خود وہاں سے جاچکی تھی۔

"اپنا آدھا گھنٹہ بچانے کے لیے اس نے نہ صرف میرا ایک گھنٹہ برباد کیا ہے بلکہ مجھے شدید ذہنی کوفت سے بھی دوچار کیا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ جب وہ مجھے وہاں نہیں ملی تو میں کتنا پریشان ہوا تھا۔" حسن نے باپ سے شکوہ کیا۔

"بچی ہے ابھی' جو سمجھ میں آیا کر گزری۔ تم غصہ تھوک دو اور اس بات کو جانے دو۔" مکرم علی جو اب تک اقصیٰ کی حمایت کررہے تھے' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

حسن نے بھی باپ کے احترام میں خاموشی اختیار کرلی لیکن اس بات کا بہرحال اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اقصیٰ نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی ہے' وہ صبح بھی اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی اور واپسی میں اس نے خود ایسا موقع پیدا کرلیا کہ اسے حسن کے ساتھ واپس نہ آنا پڑے۔ اقصیٰ کے اس طرز عمل سے اسے تکلیف زیادہ تھی یا غصہ' وہ فی الحال فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"حسن! یہاں آؤ ذرا' تم سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں۔" وہ ندا کے چھوٹے بیٹے اظفر کے گھڑسواری کا شوق پورا کرنے کے لیے گھوڑے کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا کہ ندا نے اسے پکارا۔

"جی جناب' فرمایئے لیکن ذرا جلدی' ابھی ہمارے سوار کا دل نہیں بھرا ہے' اس لیے ہم آپ کو زیادہ وقت نہیں دے سکیں گے۔" اظفر کو اپنی پیٹھ سے اتار کر وہ ندا کے پاس آیا۔ مکرم علی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

"اظفر صاحب کا دل تو کبھی گھڑسواری سے بھرتا ہی نہیں۔ گھر میں بھی سارا وقت اپنے ابا سے یہی کام لیتا ہے۔" ندا نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"معصوم بچہ ہے نا' اس لیے گدھے گھوڑے کا فرق نہیں جانتا۔ تھوڑا وقت گزرنے دیں پھر دیکھیے گا' کبھی بھی اپنے والد بزرگوار کو گھوڑا سمجھنے کی غلطی نہیں کرے گا۔" حسن' ندا کے قریب ہی صوفے پر ٹک گیا تھا۔

"خبردار جو تم نے میرے میاں کی شان میں گستاخی کی ہو تو۔" ندا نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی۔

"سچ کا تو زمانہ ہی نہیں۔" حسن نے برا سا منہ بنایا۔

"بھئی' یہ تم دونوں کس جھگڑے میں پڑگئے۔ وہ بات تو کرو ندا! جس کے لیے حسن کو بلایا ہے۔" مکرم علی نے دونوں کو ٹوکا۔

"جی ابو!" ندا فوراً ہی سنجیدہ ہوگئی۔ حسن بھی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بات یہ ہے حسن! میں اور ابو چاہ رہے ہیں کہ اب تمہارا اور اقصیٰ کا ولیمہ کردیا جائے۔ اقصیٰ بھی امتحان سے فارغ ہوچکی ہے' اس لیے اب کوئی وجہ نہیں رہی کہ رخصتی کو مزید روکا جائے۔ ہم لوگ اس بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہ رہے ہیں۔" ندا نے مختصراً بات کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میرے بجائے اقصیٰ کی رائے لے لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر وہ ذہنی طور پر راضی ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ اس پر کوئی زور زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں۔" حسن نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا تو ندا اور مکرم علی بھی سوچ میں پڑگئے۔ اقصیٰ کا حسن سے گریز ان لوگوں سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

"میں بات کروں گی اقصیٰ سے لیکن تم اس معاملے کو اتنا سیریس نہ لو۔ میرا نہیں خیال کہ وہ کوئی اعتراض کرے گی۔ ابھی تو اس کا جو رویہ ہے' وہ بالکل حالات کے مطابق ہے۔ امی کی ڈیتھ اور تم سے نکاح' دونوں باتیں اتنی اچانک ہوئی ہیں کہ وہ شاکڈ ہوگئی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔" ندا نے حسن کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس کی خوشی کا خیال رکھیں۔" حسن بہت سنجیدگی سے کہتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

"حسن ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا! تم پہلے اقصیٰ سے بات کرلو۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی دن طے کرکے دعوت نامے وغیرہ چھپوانے اور تقسیم کرنے کا کام کرلیں گے۔ ولیمہ کا ارینجمنٹ کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے ایک دوست کا کیٹرنگ کا کاروبار ہے' وہ ایک دن کے نوٹس پر بھی سب کچھ ارینج کردے گا۔"

مکرم علی نے کہا تو وہ سر ہلاتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔

"کیا بن رہا ہے بھئی۔" اقصیٰ کچن میں تھی' ندا وہیں جا پہنچی۔

"چائنیز رائس ود ہاٹ اینڈ ساور سوپ۔" آپ کے سپوت فرمائش کرکے گئے ہیں مجھ سے۔" اقصیٰ نے بوائل چکن کے ریشے کرتے ہوئے بتایا۔

"ماشاء اللہ۔ بڑی ایکسپرٹ ہوتی جارہی ہو۔" ندا نے تعریف کی تو وہ جھینپ گئی۔

"بس پیپرز کے بعد فارغ تھی تو میں نے سوچا' کچھ کوکنگ پر ہی توجہ دے لوں۔ ویسے یہ اتنا مشکل کام نہیں۔ ہر چینل سے کوکنگ کے پروگرامز آتے ہیں۔ ان میں سے کافی ڈشز میں نے ٹرائی کی ہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی بن گئیں۔" اس نے ندا کو بتایا۔

"اچھی بات ہے۔ کوشش جاری رکھو' جلد ایکسپرٹ ہوجاؤ گی اور میرے بچے جب بھی یہاں آئیں گے' اپنی ممانی جان سے فرمائش کرکے اچھے اچھے کھانے کھائیں گے۔" ندا نے اسے چھیڑا تو جواباً اس کا مسکراتا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ ندا نے اس کا یہ انداز بطور خاص نوٹ کیا۔

"ہم لوگ سوچ رہے تھے کہ اب تمہاری رخصتی کردی جائے لیکن حسن نے کہا کہ پہلے تمہاری رائے لے لوں۔ اب تم بتادو کہ تقریب کے لیے کون سا دن رکھیں پھر اسی حساب سے شاپنگ وغیرہ بھی کرلیں گے۔" ندا اب اپنے اصل مقصد کی طرف آئی۔

"پلیز ندا باجی! ابھی نہیں۔" اقصیٰ کے کام کرتے ہاتھ رک گئے تھے اور وہ بہت لجاجت سے بولی تھی۔

"لیکن کیوں؟ پہلے تم نے کہا کہ امتحان ہونے والے ہیں' ابھی رک جائیں۔ بات مناسب تھی' اس لیے ہم نے مان لی لیکن اب تو تم فارغ ہو' اب اس معاملے کو ڈیلے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" ندا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھے اپنی ٹیوڈ ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔" اقصیٰ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا تو ندا ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اقصیٰ کے شوق سے وہ سب ہی واقف تھے لیکن موجودہ حالات میں ندا کا خیال تھا کہ وہ اپنا انجینئرنگ میں ایڈمیشن کا ارادہ چھوڑ کر کسی نان پروفیشنل سبجیکٹ میں گریجویشن کرلے۔ وہ یہ بات اقصیٰ سے کہنا بھی چاہتی تھی لیکن جانے کیوں چپ ہوگئی اور اس موضوع پر مزید کوئی بات کرنے کے بجائے اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

"ٹھیک ہے' اگر اس کی یہ خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بھی اس پر کسی قسم کا دباؤ مت ڈالیے گا۔"

بعد میں جب ندا نے حسن کو اقصیٰ کے جواب کے

متعلق بتایا تو اس نے یہ جملہ کہہ کر موضوع ختم کر دیا۔ ندا تشویش سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اقصیٰ باجی! باہر کوئی آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ کتابیں سامنے رکھے پڑھنے میں مصروف تھی کہ گھریلو کاموں کے لیے رکھی گئی ملازمہ نے آکر اسے اطلاع دی۔

"مجھ سے۔۔۔؟ ایسے ہی کوئی سیلزمین وغیرہ ہوگا۔ تم کہہ دو کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"نہیں باجی! وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ مجھے اقصیٰ بی بی سے ملنا ہے۔ اس نے آپ کا نام لیا ہے۔" ملازمہ کی بات پر اسے اپنی جگہ سے اٹھنا ہی پڑا۔

"جی فرمایئے۔" گیٹ کی آڑ میں رہتے ہوئے اقصیٰ نے ذرا سا باہر جھانکا۔ لمبے قد اور گوری رنگت والے اس شخص کے نقوش بتاتے تھے کہ جوانی میں وہ بہت خوبصورت رہا ہوگا لیکن اب بے حد خراب صحت اور سفید بالوں نے اس کی ساری خوبصورتی کو ماند کر دیا تھا۔

"اقصیٰ۔۔۔ اقصیٰ بیٹے۔۔۔۔ یہ میں ہوں تنویر خان۔۔۔ تمہارا ابو۔۔۔ بیٹے۔۔۔۔!" وہ شخص لپک کر نزدیک آیا۔

"میرے ابو۔۔۔" اقصیٰ یکدم ہی پورا گیٹ کھول کر سامنے آگئی۔ اس کے باپ کا نام تنویر خان ہے' یہ تو وہ بھی جانتی تھی لیکن ان کے بارے میں اسے زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔ گھر میں کوئی اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اقصیٰ خود بھی سب کی محبتوں میں گھری ہوئی کبھی اس شخص کو یاد نہیں کرتی تھی جسے اس کے باپ ہونے کا شرف حاصل تھا۔

"آپ سچ مچ میرے ابو ہیں؟" اس نے بے یقینی سے سامنے کھڑے شخص سے پوچھا۔

"ہاں میری جان! میں تمہارا ابو ہی ہوں۔" تنویر خان کے لہجے میں زمانے بھر کا پیار چھلک رہا تھا۔

"آپ اتنے سالوں سے کہاں تھے؟" اپنی آنکھوں میں اترتی نمی کو اندر اتارتے اس نے پوچھا۔

"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا لیکن پہلے تم مجھے اندر تو آنے دو۔ گیٹ پر کھڑے کھڑے تو یہ ساری باتیں نہیں ہو سکتیں نا۔" تنویر خان نے کہا تو اقصیٰ کو بھی اپنی پوزیشن کا اندازہ ہوا۔

"آپ اندر آجائیں۔" اقصیٰ اسے اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"تم بہت پیاری ہو' بالکل اپنی ماں پر گئی ہو۔ گیٹ پر تمہاری ایک جھلک دیکھتے ہی مجھے زرینہ کی یاد آگئی تھی۔ زرینہ کے ساتھ مجھے زندگی کے بہت کم دن گزارنا نصیب ہوئے لیکن وہ چند دن میری زندگی کے سب سے قیمتی دن ہیں۔ زرینہ کے اس مختصر ساتھ کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔" اقصیٰ کی صورت کو پیار سے تکتے ہوئے تنویر خان کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"آپ امی سے بہت محبت کرتے تھے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ تھی ہی ایسی کہ اس سے محبت کی جائے۔" تنویر خان نے خلاؤں میں تکتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر آپ انہیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟" بیٹی باپ کا احتساب کر رہی تھی۔

"میں نے کب چھوڑا تھا اسے' مجھے تو مجبور کر دیا گیا تھا۔" تنویر خان نے دکھی لہجے میں کہا۔

"کس نے مجبور کیا تھا؟" اس کا تجسس جاگا۔

"ان ہی لوگوں نے جو آج تم پر بھی قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔"

"خالہ جان اور خالو جان!" اقصیٰ کے انداز میں بے یقینی تھی۔ "لیکن کیوں؟" تنویر خان کے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ان کے معیار پر پورا جو نہیں اترتا تھا۔ زرینہ کی ضد سے مجبور ہو کر تمہاری خالہ جان نے ہماری شادی تو کروا دی لیکن کبھی اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہیں کہ کسی طرح ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے اور جب تم ڈھائی سال کی تھیں تو انہیں موقع مل گیا۔ میرے اور زرینہ کے درمیان کسی معمولی سی بات پر نااتفاقی پیدا ہو گئی جسے ہوا دے کر ناراضی تک پہنچا دیا گیا۔ زرینہ کو تمہاری خالہ جان نے میکے میں بٹھا لیا اور بس اس کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا۔ مجھے موقع ہی نہیں دیا گیا کہ میں زرینہ کو منا سکوں۔ میں کئی بار یہاں آیا لیکن کسی نے مجھے زرینہ سے ملنے نہیں دیا بلکہ دھمکیوں پر اتر آئے۔ تمہارے خالو جان کے کئی شاگرد پولیس میں بھی تھے۔ ان لوگوں کے ذریعے مجھے دھمکایا گیا کہ میں زرینہ کا پیچھا چھوڑ دوں۔ مجھے گرفتار کر کے تھانے

میں تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔

میں غریب اور بے اختیار سا آدمی ان اوچھے ہتھکنڈوں کے سامنے کب تک ٹھہرتا۔ تھک ہار کر چپ ہو بیٹھا لیکن جب مجھے زرینہ کے انتقال کی خبر ملی تو میں رو نہیں سکا۔ میں ایک بار پھر ہمت کر کے یہاں آیا لیکن ان لوگوں نے دھکے دے کر مجھے یہاں سے نکلوا دیا۔ میں بہت تڑپا' بہت فریاد کی کہ مجھے میری بیوی کا آخری دیدار تو کروا دو لیکن ظالموں نے میری ایک نہ سنی۔ بعد میں بھی میں نے یہاں کے چکر لگائے کہ بیوی نہیں رہی تو کم از کم مجھے میری اولاد تو واپس کردو لیکن ان لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ایک بار پھر میرے ساتھ پولیس تھانے کا کھیل کھیلا گیا۔ بس پھر میں ہمت ہار گیا لیکن تمہاری محبت' تم سے ملنے کی تڑپ تو ہمیشہ میرے دل میں قائم رہی۔ ابھی کچھ روز قبل مجھے معلوم ہوا کہ امینہ بیگم کا انتقال ہو گیا ہے تو میرے دل میں ایک امید سی پیدا ہوئی کہ شاید اب مجھے تم سے ملنے کا موقع مل جائے۔ میں نے مکرم علی سے اس سلسلے میں رابطہ کیا لیکن انہوں نے مجھے تم سے ملنے کی اجازت نہیں دی لیکن میں تمہارا باپ ہوں' میرا دل تمہارے لیے تڑپتا ہے' اسی لیے میں یہ کھوج لگانے کے بعد کہ کس وقت تم گھر میں اکیلی ہوتی ہو' آج اس وقت تم سے ملنے یہاں آیا ہوں۔"

بہتے آنسوؤں کے ساتھ تنویر خان جو داستان سنا رہا تھا' وہ اقصیٰ کے لیے بے حد غیر یقینی تھا۔ محبت کرنے والی خالہ جان اور شفیق خالو جان کا جو روپ اس کے باپ نے اس کے سامنے پیش کیا تھا' وہ اقصیٰ کے لیے بہت اجنبی تھا لیکن تنویر خان کے آنسو بھی اس پر بیتے ظلم اور دکھوں کی داستان سنا رہے تھے۔ اقصیٰ تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں آسانی سے میری بات کا یقین نہیں آئے گا لیکن جو سچ تھا' وہ میں نے بتا دیا۔ تم یہاں خوش ہو' خوش رہو۔ میں تو بس اپنی محبت سے مجبور ہو کر ایک نظر تمہیں دیکھنے چلا آیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں تمہیں دیکھنے کی آرزو اس ٹوٹے پھوٹے دل میں لیے ہی اس دنیا سے نہ چلا جاؤں۔"

تنویر خان نے اقصیٰ کی آنکھوں میں موجود بے یقینی پڑھ لی تھی۔

"اچھا بیٹی! چلتا ہوں لیکن تم سے بس اتنی التجا ہے کہ کہیں سے اگر باپ کے مرنے کی اطلاع سنو تو جنازے میں ضرور آجانا۔ یہ دل جو ساری زندگی درد سہتا رہا ہے' شاید وقت رخصت ہی کچھ خوشی پالے۔"

"آپ ایسی باتیں مت کریں۔" خون کی کشش نے بالآخر جوش مارا۔

"یہ باتیں نہ بھی کریں تو سچائی بدل تھوڑی جائے گی۔ بس اب تو کچھ ہی دنوں کی کہانی ہے۔ جانے کب فرشتہ اجل ہماری روح قبض کرنے آپہنچے۔" تنویر خان نے بڑے حسرت زدہ انداز میں کہا۔

"کیا..... کیا ہوا ہے آپ کو؟" اقصیٰ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا' بس یہ دل ہی ستم سہہ سہہ کر حوصلہ چھوڑ بیٹھا ہے۔ اب ساتھ نبھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں یہ کب کام کرنا بند کردے' کچھ معلوم نہیں۔" اپنا سینہ سہلاتے ہوئے تنویر خان نے کمزور سی آواز میں بتایا تو اقصیٰ تڑپ سی گئی۔ سامنے کھڑا شخص اس کا باپ تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ اس کے پاس زندگی کی مہلت ختم ہوئی جارہی تھی۔

"تمہیں دیکھ لیا' تم سے چند باتیں کرلیں۔ بس سمجھو کہ میری زندگی کی ایک بہت بڑی تمنا پوری ہو گئی۔ اب موت ابھی جائے تو میں تمہاری یہ پیاری صورت اپنی آنکھوں میں بسا کر خوشی سے جان دے دوں گا۔" تنویر خان نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"آپ پھر کب آئیں گے' مجھ سے ملنے؟" تنویر خان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ رندھی ہوئی آواز میں اس سے پوچھنے لگی۔

"تم دوبارہ مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟" تنویر خان پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اقصیٰ نے بہت تیزی سے سر ہلا کر اسے اثبات میں جواب دیا۔

"میری بیٹی کہے گی تو میں روزانہ بھی اس سے ملنے یہاں آسکتا ہوں۔" تنویر خان نے جوش سے کہا۔

"میں کل آپ کا اسی وقت انتظار کروں گی۔"

"میں ضرور آؤں گا۔ اگر موت بھی راستے میں آکھڑی ہوئی تو اسے بھی ہرا کر آجاؤں گا۔"

تو تنویر خان نے پُرجوش انداز میں وعدہ کیا۔ اقصیٰ گیٹ تک انہیں رخصت کرنے گئی اور وہاں کھڑی ہو کر اس وقت تک انہیں دیکھتی رہی' جب تک وہ گلی کا موڑ مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"یہ تمہارے ہاتھ پر کیا ہوا ہے اقصیٰ؟" وہ رات کا کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگا رہی تھی کہ اس کی کلائی سے ذرا اوپر موجود سرخ نشان کو دیکھتے ہوئے مکرم علی نے اس سے پوچھا۔ اقصیٰ نے ان کے توجہ دلانے پر اپنی کلائی کا جائزہ لیا۔ اسے خیال آیا کہ کھانا بناتے ہوئے اس کا ہاتھ گرم پتیلے سے جا لگا تھا۔ جلن اس وقت بھی ہوئی تھی اور اب بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنی سوچوں میں اتنا غرق تھی کہ اسے اس تکلیف کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں ملی تھی۔

"کیا ہوا بھئی' تم تو ایسی نظروں سے اس نشان کو دیکھ رہی ہو جیسے خود تمہیں بھی یہ ابھی ہی نظر آیا ہے۔" مکرم علی کی جہاندیدہ نظروں نے اقصیٰ کا انداز بھانپا۔

"کچھ نہیں ہے خالو جان! بس ذرا ہاتھ جلا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے انہیں ٹالا۔

"ایسے کیسے ٹھیک ہو جائے گا' کوئی دوا لگاؤ اس پر۔" مکرم علی نے اسے ٹوکا۔

"جی کھانے کے بعد لگا لوں گی۔" اس نے کہتے ہوئے سالن کا ڈونگہ ان کی طرف بڑھایا تو وہ خاموش ہو گئے اور اپنی پلیٹ میں سالن نکا لنے کے بعد ڈونگہ حسن کی طرف کھسکا دیا۔ حسن کے بعد اقصیٰ نے بھی اپنی پلیٹ میں ذرا سا سالن ڈالا اور بے دلی سے نوالہ بنانے لگی۔ اس کا انداز اتنا واضح طور پر الجھا ہوا تھا کہ مکرم علی اور حسن دونوں ہی نے اسے محسوس کیا پھر سالن کا ذائقہ بھی روزانہ جیسا نہیں تھا۔ نئی نئی گھرداری شروع کرنے کے باوجود ان لوگوں نے کبھی اس کے پکائے گئے کھانے میں نمک' مرچ کا ایسا عدم توازن نہ پایا تھا جو آج محسوس ہو رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کھانا شدید ذہنی انتشار کے ساتھ پکایا گیا ہے۔ دونوں نے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اقصیٰ جس نے خود بمشکل دو تین نوالے ہی لیے تھے' اس بات کو محسوس بھی نہیں کر سکی۔ وہ جس کیفیت میں تھی' اس میں تو شاید اس نے سالن کا ذائقہ بھی صحیح سے محسوس نہیں کیا تھا۔ کھانے والوں کے تاثرات کیا خاک نوٹ کرتی۔

"برتن سمیٹنے کے بعد مجھے میرے کمرے میں ایک گلاس دودھ دے جانا بیٹا!" مکرم علی نے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے اقصیٰ کو ہدایت دی۔

ان کے پیچھے ہی حسن بھی ٹیبل سے اٹھ گیا۔ اقصیٰ تو پہلے ہی بے دلی سے بیٹھی تھی' فوراً ہی ہاتھ میں موجود روٹی کا ٹکڑا رکھ کر ڈائننگ ٹیبل پر سے برتن اٹھانے لگی۔ برتن سمیٹنے کے بعد اس نے دودھ گرم کیا اور گلاس میں نکال کر مکرم علی کے کمرے میں چلی آئی۔

"خالو جان! یہ آپ کے لیے دودھ۔" اس نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور پلٹنے لگی۔

"کہاں جارہی ہو اقصیٰ! تھوڑی دیر بیٹھو یہاں۔" مکرم علی نے اسے پکارا تو ناچار اسے رکنا پڑا۔

"کیا بات ہے۔ آج ہماری بیٹی کچھ الجھی الجھی نظر آرہی ہے؟" انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو....." اس نے کمزور لہجے میں تردید کی۔

"اگر کچھ نہیں ہے تو تمہارا چہرہ اتنا اترا ہوا اور اداس کیوں لگ رہا ہے۔" مکرم علی نے مسکرا کر کہا۔

"آج مجھے امی بہت یاد آرہی ہیں۔" اقصیٰ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ جو بات کہی' وہ مکرم علی کے لیے حیرت انگیز تھی۔ اتنے سالوں میں انہوں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو یاد کیا ہو' چہ جائیکہ آنسو بہانا۔

"یہ سب تو تقدیر کے کھیل ہیں بیٹا! زندگی میں کب کس موڑ پر کون سا رشتہ ساتھ چھوڑ جائے کچھ نہیں معلوم۔ بس یہ ہے کہ جلد یا بدیر جانا تو بہرحال سب کو ہی ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کے پاس تو فقط صبر کا راستہ ہی رہ جاتا ہے۔" حیرت سے سنبھلتے ہوئے مکرم علی نے اسے سمجھانے کا فریضہ انجام دیا۔

"مرنے والوں پر تو صبر آجاتا ہے لیکن جن کا ساتھ جیتے جی چھوٹ جائے ان پر کیسے صبر کریں۔" آج اقصیٰ انہیں حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"کس کی بات کر رہی ہو تم؟" انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"اپنے ابو کی۔ وہ تو زندہ ہیں نا۔ اسی ملک میں' اسی شہر میں کہیں رہتے ہیں پھر کیوں میں ان سے محروم ہوں۔" اقصیٰ کی بات کسی بم کی طرح ان کے اعصاب پر گری تھی۔

"وہ شخص اس لائق نہیں کہ اس کے بارے میں گفتگو بھی کی جائے۔ بہتر ہے کہ تم اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔" مکرم علی سنبھلے تو ناگواری سے جواب دیتے ہوئے دوبارہ اس کتاب کو اٹھا لیا جو وہ اقصیٰ کے آنے سے پہلے پڑھ رہے تھے۔

"اب تم جاؤ اور جاکر سو جاؤ۔ صبح مجھے جلدی کالج پہنچنا ہے۔ ناشتہ ذرا جلدی بنا دینا۔" وہ رکھائی سے بولے تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ البتہ اس کا ذہن پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے' ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ یہ لوگ ابو کو ان کی غربت کی وجہ سے کسی لائق نہیں سمجھتے' اسی لیے انہیں ان کا ذکر تک سننا گوارا نہیں لیکن میں کیسے کسی کے حکم پر ان کا خیال اپنے دل سے نکال دوں۔ آخر میں ان کی اولاد ہوں۔" وہ اپنی سوچوں میں غلطاں اپنے کمرے میں جارہی تھی کہ اسے پیچھے سے حسن نے پکارا۔ وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ مرہم لگوالو اپنے ہاتھ پر۔ آرام آجائے گا۔" وہ کوئی ٹیوب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اپنی ہمدردی اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے اس بھیک کی۔" وہ جو بہت الجھی ہوئی تھی' حسن کو تلخی سے جواب دے کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ حسن کے چہرے پر جو غصے کی سرخی چھائی تھی' وہ تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

"ماشاء اللہ۔ بہت ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔ تمہاری ماں بھی بہت لذیذ کھانے بنایا کرتی تھی۔" فروٹ ٹرائفل سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے تنویر خان نے اسے سراہا تو اس کا چہرہ اپنی تعریف پر کھل اٹھا۔

"کیا آپ امی سے بہت محبت کرتے تھے؟" دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھتے ہوئے اقصیٰ نے اشتیاق سے تنویر خان سے پوچھا۔

"اتنی کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ بس یوں سمجھو کہ لوگ ہمیں ایک جان دو قالب کہتے تھے۔ اس کے بغیر میں کیسے جی رہا ہوں' اس کا اندازہ تو تم میری حالت دیکھ کر بھی لگا سکتی ہو۔" تنویر خان نے افسردگی سے جواب دیا۔

"آپ اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے۔ آج کل تو علاج کی بہت جدید سہولیات موجود ہیں۔ پیچیدہ ترین امراض کا بھی علاج ہوجاتا ہے۔ آپ کسی اچھے کارڈیولوجسٹ سے اپنا چیک اپ کروائیں۔" اقصیٰ نے کہا تو تنویر خان ہنس دیا۔

"آپ اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں؟" وہ اس ہنسی کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔

"سوچ رہا ہوں میری بیٹی کتنی معصوم ہے۔ اپنے باپ کی حیثیت سے واقف ہونے کے باوجود اسے ایسے مشورے دے رہی ہے۔ اچھے ڈاکٹرز' اچھا علاج اور اچھی دوائیں سب پیسے سے خریدا جاتا ہے اور میں تو اتنا مفلس ہوں کہ برسوں بعد ملنے والی بیٹی کے لیے کوئی ڈھنگ کا تحفہ بھی خرید کر نہیں لا سکتا۔ سو پچاس سے زیادہ کی میری حیثیت نہیں اور تم عادی ہو ہزاروں کی چیزیں برتنے کی' اسی لیے خالی ہاتھ ہی یہاں چلا آتا ہوں۔" تنویر خان نے بے چارگی سے کہا تو اقصیٰ کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور تنویر خان کے قدموں میں آبیٹھی۔

"سوری ابو! میری بات نے آپ کو ہرٹ کیا لیکن سچ کہوں تو آپ نے بھی مجھے بری طرح ہرٹ کیا ہے۔ بے شک مجھے خالہ جان کے گھر میں ہزاروں کی چیزیں نصیب ہیں لیکن آپ میرے لیے دس روپے کی بھی کوئی چیز لاتے تو وہ مجھے ان سب چیزوں سے بڑھ کر عزیز ہوتی۔ تحفے کو قیمت سے نہیں دینے والے کے خلوص سے پرکھا جاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

"سوری بیٹا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ مادہ پرست لوگوں کے درمیان رہنے والی میری بیٹی اتنی حساس اور پرخلوص ہوگی۔ اگلی بار جب میں یہاں آؤں گا تو تمہارے لیے ضرور کوئی تحفہ لاؤں گا۔" تنویر خان نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔

"اور آپ اپنا چیک اپ بھی کروائیں گے۔" اقصیٰ نے پیار بھرا اصرار کیا۔

"اس کا میں وعدہ نہیں کرسکتا بیٹا! میں مجبور ہوں۔" تنویر خان نے معذوری کا اظہار کیا۔

"آپ پیسوں کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں نا؟" تنویر خان نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ بس آپ پانچ منٹ میرا انتظار کریں۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے الماری کھولی۔ کپڑوں کی تہہ کے نیچے کئی نوٹ دبے ہوئے تھے۔ یہ وہ روپے تھے جو اسے گھر کے افراد کی طرف سے وقتاً فوقتاً جیب خرچ کے طور پر ملا کرتے تھے لیکن عموماً اس رقم کو خرچ کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اس کی تمام ضروریات اور خواہشات اس

کے کہنے سے پہلے ہی پوری کردی جاتی تھیں' اسی لیے اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی تھی۔ اقصیٰ کی یادداشت کے مطابق وہ کوئی بیس ہزار کے قریب رقم تھی۔ اس نے سارے پیسے باہر نکالے اور انہیں ایک خالی لفافے میں رکھ کر واپس ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"کہاں چلی گئی تھیں بیٹا!" تنویر خان نے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"بس ایک ضروری کام تھا۔" کہتے ہوئے وہ اس کے قریب آبیٹھی۔

"آپ سے ایک بات پوچھوں ابو؟"

"ضرور میری جان!" تنویر خان نے اپنا بازو اس کے شانے پر پھیلایا۔

"اگر میں بیٹی کے بجائے آپ کا بیٹا ہوتی تو آپ کیسا محسوس کرتے؟"

"بالکل ویسا ہی جیسا ابھی محسوس کرتا ہوں۔ میں بیٹے' بیٹی میں فرق رکھنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ اگر آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو تمہیں بتاتی کہ تمہاری پیدائش پر میں کس قدر خوش ہوا تھا۔ تمہارے لیے میں اور تمہاری امی مل کر بہت اونچے اونچے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ خواب دیکھتے ہوئے ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ تم ہماری بیٹی ہو۔ تم بس ہماری اولاد تھیں جس سے ہم نے اپنی بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ کرلی تھیں لیکن ہماری قسمت کی خرابی کہ ہم دونوں مل کر اپنے خوابوں کو پروان نہ چڑھا سکے۔" تنویر خان کی آواز بھرآنے لگی۔

"میں وعدہ کرتی ہوں ابو! کہ میں آپ کے ہر خواب کو پورا کرکے دکھاؤں گی لیکن ابھی آپ کو اپنا دعوا ثابت کرنا ہوگا کہ آپ بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔" اقصیٰ نے کہا۔

"وہ کیسے؟" تنویر خان نے پوچھا۔

"آپ کو یہ رکھنا ہوگا۔ بغیر کوئی سوال کیے' بالکل اسی حق کے ساتھ جیسا آپ اپنے بیٹے کی کمائی پر محسوس کرتے۔" اقصیٰ نے براؤن لفافہ تنویر خان کے ہاتھ میں رکھا۔

"لیکن بیٹا..." اس نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ آپ کو یہ رکھنے ہوں گے اور اپنا چیک اپ بھی کروانا ہوگا' ورنہ میں آپ سے نہیں ملوں گی۔" اقصیٰ نے دھمکی دی۔

"یہ بات کہہ کر تو تم نے مجھے مجبور کردیا ہے بیٹا! میں اتنے برسوں بعد ملنے والی اپنی بیٹی سے جدائی کیسے برداشت کرسکتا ہوں۔" تنویر خان نے جیسے بہت مجبوری کے عالم میں خاکی لفافہ اپنی جیب میں رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اقصیٰ نے خالی خالی نگاہوں سے اپنے سامنے رکھے رائٹنگ پیڈ کو دیکھا۔ سفید کاغذ پر محض چند آڑی ترچھی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ اس کوشش میں تھی کہ میتھس کے چند سوالوں کی پریکٹس کرلے لیکن اس کا ذہن اس قدر منتشر تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کرپارہی تھی۔ اس کی زندگی اچانک ہی بہت سے غیر معمولی واقعات کا شکار ہوگئی تھی۔ جب ماں مری تو اس وقت تو خیر اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا لیکن امینہ بیگم کے انتقال نے اسے بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی کہ اچانک اس کا نکاح حسن سے کردیا گیا۔ حسن... جسے اس نے کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ حسن بھی اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں رکھتا۔ اس کا معیار بہت اونچا تھا' وہ اپنے لیے ایک آئیڈیل لڑکی کی تلاش میں تھا لیکن خالو جان نے زبردستی اسے اقصیٰ کے ساتھ باندھ دیا۔ مجبوری کا یہ رشتہ تو وہ شاید ساری زندگی نبھا دیتا لیکن اقصیٰ کو اپنا آپ بہت حقیر محسوس ہوتا تھا۔

وہ زبردستی حسن کے سر تھوپ دی گئی ہے' یہ احساس اسے اس رشتے کو قبول نہیں کرنے دے رہا تھا اور اب اچانک باپ کا چلے آنا ایک اور امتحان تھا۔ جو اپنے ساتھ ماضی سے متعلق بہت سے انکشافات لے کر آیا تھا۔ امینہ بیگم اور باقی گھر والوں کی محبت کو دیکھتے ہوئے تنویر خان کی باتوں پر یقین کرنا مشکل تھا لیکن اقصیٰ کے علم میں ایسے کئی واقعات تھے جہاں طبقاتی فرق نے ایسی کہانیاں جنم دیں۔ خاندانی اور وضع دار دکھائی دینے والے لوگ معاشی طور پر کمزور شخص کو اپنے خاندان کا حصہ تسلیم کرنے سے عموماً گریز کرتے ہیں۔

اقصیٰ کو ان لوگوں کی طرف سے جو پیار ملا تھا' اس کے پیش نظر وہ اپنے باپ کے ساتھ کی جانے والی اس زیادتی کے لیے کسی کا احتساب کرنے کی جرات تو نہیں رکھتی تھی لیکن اسے اپنے باپ سے ملنے کا حق حاصل تھا اور اس حق

سے وہ ہرگز دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تنویر خان کا خیال آتے ہی اسے ایک بار پھر یہ بات یاد آئی کہ جس دن اس نے اسے رقم دی تھی' اس دن کے بعد سے تنویر خان نے اسے اپنی شکل دوبارہ نہیں دکھائی تھی۔ وہ تشویش کا شکار ہونے لگی۔

تنویر خان کو ہسپتال جانا تھا چیک اپ کے لیے اور اقصیٰ ڈر رہی تھی کہ کہیں کوئی بہت زیادہ پریشانی کی بات نہ ہو۔ اتنے برسوں بعد ملنے والے اپنے باپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔ باپ کی خیریت کی طرف سے پریشانی کے باعث اس کا الجھا ہوا ذہن مزید الجھ کر رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے سب سے اہم مقصد کے حصول کے لیے بھی ذہن کو مرکوز نہیں رکھ پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں تھے آپ دو دن سے۔ میں اتنی بے چینی سے آپ کا انتظار کرتی رہی لیکن آپ آئے ہی نہیں۔" تیسرے دن تنویر خان اپنے مخصوص ٹائم پر ملنے آیا تو اقصیٰ نے بے قراری سے پوچھا۔

"سوری بیٹا! مجھے احساس تھا کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو گی لیکن نہ آنے کا سبب بھی تمہاری خواہش ہی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ میں اپنا چیک اپ ضرور کرواؤں تو بس اسی سلسلے میں مصروف رہا۔ ڈاکٹروں نے تو تمہیں معلوم ہی ہے بس لگے رہے کہ یہ ٹیسٹ کروالو' وہ ٹیسٹ کروالو۔ اسی بھاگ دوڑ میں' میں یہاں نہیں آسکا۔" تنویر خان نے جھٹ معذرت کرتے ہوئے اپنے نہ آنے کی وجہ بیان کی۔

"پھر کیا کہا ڈاکٹر نے؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں لیکن پہلے کچھ کھانے پینے کے لیے تو لے آؤ۔ رات سے کچھ نہیں کھایا کہ تم سے ملنے جاؤں گا تو بس تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا ہی جی بھر کر کھاؤں گا۔"

"میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ فوراً" ہی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ تنویر خان اسے دیکھتا رہا۔ وہ شکل و صورت میں ہی نہیں بلکہ معصومیت میں بھی اپنی ماں کا پرتو تھی۔

"آپ دو دن سے آئے نہیں' اس لیے آج میں نے پریشانی میں کوئی خاص اہتمام بھی نہیں کیا۔ بس آج جو کچھ پکا تھا' اسی کے ساتھ گرم گرم پھلکے بنا کر لے آئی ہوں۔ آپ اتنی دیر سے بھوکے نہیں ہوتے تو کچھ وقت لگا کر کوئی جلدی سے بن جانے والی ڈش تیار کر دیتی۔" دس منٹ بعد اقصیٰ بھری ہوئی ٹرے کے ساتھ واپس آئی اور تنویر خان کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

"اقصیٰ باجی..... میں نے بڑے صاحب اور حسن بھائی کے میلے کپڑے ان کے کمرے سے نکال لیے ہیں۔ اگر آپ کو بھی اپنے کپڑے دھلوانے ہیں تو بتا دیں۔" ملازمہ نے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر اقصیٰ کو پکارا۔

"میرے کپڑے تو نہیں البتہ ایسا کرو الماری سے نئی بیڈ شیٹ نکال کر میرے بیڈ پر بچھا دو اور پہلے والی دھو دو۔" اقصیٰ نے اسے ہدایت دی تو وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئی۔

"یہ میرے یہاں آنے کے بارے میں کسی کو بتا تو نہیں دے گی؟" تنویر خان جو ملازمہ کو بغور دیکھ رہا تھا' اس کے جانے کے بعد اقصیٰ سے پوچھنے لگا۔

"بالکل نہیں۔ اول تو یہ دوپہر میں خالو جان کے کالج سے واپس آنے سے پہلے ہی چلی جاتی ہے۔ دوسرے میں نے خود بھی اسے منع کر رکھا ہے کہ یہ فی الحال کسی کو آپ کی یہاں آمد کے بارے میں نہ بتائے۔" اقصیٰ نے تسلی دی۔

"کیسی خراب قسمت ہے میری' اپنی سگی بیٹی سے چوروں کی طرح ملنے آنا پڑتا ہے۔" حسرت زدہ انداز میں کہتے ہوئے تنویر خان نے پلیٹ پرے کھسکائی۔

"آپ نے ہی منع کر دیا' ورنہ میں تو ہرگز اس بات کو نہیں چھپاتی۔ آخر آپ میرے باپ ہیں' آپ کو حق ہے مجھ سے ملنے کا۔" اقصیٰ نے جوش سے کہا۔

"نہیں بیٹا! یہ غلطی ہرگز نہ کرنا' ورنہ یہ لوگ اپنے پرانے ہتھکنڈوں پر اتر آئیں گے۔ میں جوانی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا تو اب اس بڑھاپے اور کمزوری میں کیسے ان کے سامنے ٹک سکوں گا۔ تمہارے خالو کو پتہ چل گیا تو وہ مجھ سے' تم سے ملاقات کی یہ گھنٹے دو گھنٹے کی خوشی بھی چھین لیں گے۔" تنویر خان کے لہجے میں بے بسی تھی جس نے اقصیٰ کے دل کو غصے اور شکوے سے بھر دیا۔

"آپ فکر نہ کریں جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی لیکن آپ خود پر بوجھ نہ لیں اور مجھے بتائیں کہ ڈاکٹر نے آپ کی طبیعت کے بارے میں کیا کہا؟"

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میرا علاج صرف بائی پاس ہی ہے اور تم تو جانتی ہو کہ یہ کتنا مہنگا علاج ہے۔ ڈھائی تین لاکھ تو کم از کم چاہیے ہی ہوں گے۔ اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں۔ بس اسی لیے صبر کر لیا ہے۔" تنویر خان نے بے چارگی سے کہا تو اقصیٰ بھی سوچ میں پڑ گئی۔ چند ہزار کی بات ہوتی تو وہ کسی نہ کسی طرح انتظام کر ہی لیتی لیکن یہ تو لاکھوں کا معاملہ تھا جو کہ اختیار سے باہر تھا۔

"تم کیوں اداس ہو گئیں بیٹی! اداسی دور کرو اپنے چہرے سے اور دیکھو' میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" تنویر خان نے اپنے ساتھ لایا ڈبہ اقصیٰ کی طرف بڑھایا۔ ڈبے میں زرد رنگ کی کانچ کی چوڑیاں تھیں جن کے ساتھ سنہری چوڑیاں ملا کر سیٹ بنایا گیا تھا۔

"ابھی پہن کر دکھاؤ مجھے یہ چوڑیاں۔ دیکھوں تو میری بیٹی کے ہاتھ میں کیسی لگتی ہیں۔" اقصیٰ نے چوڑیوں کا رنگ اور ڈیزائن اپنے مزاج سے میل نہ کھانے کے باوجود محض باپ کا دل رکھنے کے لیے چوڑیاں پہن لیں۔

"ماشاء اللہ۔ ان معمولی چوڑیوں کی قسمت جاگ گئی میری بیٹی کے ہاتھوں میں جا کر۔" اس نے سراہا تو وہ کھل اٹھی۔

"اچھا بیٹا! چلتا ہوں۔ کل تو چھٹی کا دن ہے' سب لوگ گھر پر ہوں گے' اس لیے میں نہیں آسکوں گا لیکن پرسوں کے لیے میرا تم سے وعدہ ہے۔ پرسوں میں ضرور تم سے ملنے آؤں گا۔" تنویر خان نے اجازت چاہی تو اقصیٰ حسرت سے اسے جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ وہ باپ جو ابھی چند دن پہلے اس کی زندگی میں آیا تھا' نہ جانے کب اس کا ساتھ چھوڑ کر اس دنیا سے چلا جاتا' کچھ معلوم نہیں تھا۔ اسے بہت شدت سے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم ریسٹ کرو آج' کھانا میں بنا دیتی ہوں۔ ابو کہہ رہے تھے کہ شاید اقصیٰ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بہت تھکی تھکی اور پریشان سی دکھائی دے رہی ہے۔" حسب معمول ندا ویک اینڈ پر آئی ہوئی تھی۔ اقصیٰ کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں آئی تو ندا بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"تھینک یو ندا باجی! آج کل واقعی میں بالکل بھی اچھا کھانا نہیں پکا رہی۔ اچھا ہے آج آپ کھانا پکا دیں تو سب لوگ ڈھنگ سے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیں گے۔" اقصیٰ فوراً" ہی پیچھے ہٹ گئی۔

"پلاؤ اور چکن کڑاہی پکا لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" ندا نے رائے مانگی۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" اقصیٰ کے انداز میں بے دلی تھی۔

"کیا کوئی پریشانی ہے اقصیٰ!" ندا نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' بس وہ رزلٹ کی ٹینشن ہے کہ پتہ نہیں کیسے مارکس آئیں گے پھر ٹیسٹ کے لیے بھی اچھی طرح تیاری نہیں ہو پا رہی تو مجھے تھوڑا سا ڈپریشن ہو رہا ہے۔" اقصیٰ نے نظریں چراتے ہوئے بہانہ بنایا۔

"اللہ نے چاہا تو تمہارے مارکس اچھے ہی ہوں گے۔ رہی ٹیسٹ کی تیاری تو اگر زیادہ مشکل پیش آرہی ہے تو حسن سے کہو وہ تمہاری ہیلپ کر دے گا۔" ندا نے اس کے بہانے کو سچ جانا تھا' اس لیے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ مشورے سے بھی نوازا۔

"مشکل تو خیر کوئی نہیں ہے۔ بس یوں ہی ذرا دل نہیں لگ رہا ہے پڑھائی میں' اس لیے تیاری نہیں ہو پا رہی۔" اس کے گریز پر ندا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ مچلنے لگی۔ یہ وہی اقصیٰ تھی جو دن رات حسن کے گلے کا ہار بنی رہتی تھی اور اب رشتہ بدلا تھا تو وہ حسن سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی جھجکتی تھی۔

"آپ مائنڈ نہ کریں ندا باجی! تو میں کچھ دیر کے لیے اپنے کمرے میں جا کر اسٹڈی کر لوں۔" اقصیٰ نے ندا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ لی تھی اور اس کا مفہوم سمجھ کر جھینپ سی گئی تھی' اس لیے کچن سے فرار کی راہ ڈھونڈی۔

"بالکل' میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا ہے کہ کھانا میں پکا دوں گی' اب اگر تم مجھے نند سمجھ کر خود ہی تکلف سے کام لے رہی ہو تو اس میں میرا کیا قصور۔" ندا ایک بار پھر اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی۔

وہ بنا کوئی تاثر چہرے پر لائے جلدی سے کچن سے باہر نکل گئی۔ دوبارہ وہ کمرے سے تب ہی باہر نکلی تھی' جب ندا نے اسے کھانے کے لیے آواز دی تھی۔

"بیٹا! کھانے کے بعد تم تینوں میرے کمرے میں آنا' مجھے تم لوگوں سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" سب لوگ ڈائننگ ٹیبل پر جمع ہوئے تو مکرم علی نے ان تینوں سے کہا۔

"خیریت تو ہے نا ابو!" تینوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ندا نے مکرم علی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، بالکل خیریت ہے۔ بس ایک اہم ذمہ داری ہے میرے سر پر جسے میں آج ادا کردینا چاہتا ہوں۔" مکرم علی نے بشاشت سے جواب دیا تو وہ لوگ قدرے مطمئن ہوگئے۔ ندا کے بچوں کی شوخیوں نے بھی ماحول کو زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہنے دیا اور کھانا خوش گوار موڈ میں رغبت سے کھایا گیا۔ یوں بھی آج بہت دنوں بعد اس گھر میں ڈھنگ کا کھانا پکا تھا۔ اقصیٰ خود بھی اس فرق کو محسوس کررہی تھی اور دل ہی دل میں قدرے شرمندہ بھی تھی، اس لیے جب کھانے کے بعد برتن سمیٹ کروہ اور ندا کچن میں آئیں تو وہ ندا سے بولی۔

"آپ جائیں ندا باجی! چائے میں بنالوں گی۔" اور پھر اس نے بہت لگن اور دھیان سے چائے بنائی تھی۔

"زبردست اقصیٰ بیٹا! آج تو تم نے دل ہی خوش کردیا۔" اس نے سب کو چائے سرو کی تو مکرم علی نے پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے سراہا۔ اس وقت وہ سب مکرم علی کے کمرے میں موجود تھے۔ بچوں کو ندا نے کمپیوٹر پر کوئی گیم لگا کر مصروف کردیا تھا۔

"سوری خالو جان! مجھے احساس ہے کہ پچھلے چند دن سے میں اچھا کھانا نہیں پکا رہی ہوں۔" اقصیٰ نے لگے ہاتھوں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت کرلی۔

"ارے نہیں بیٹا! یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں جس کے لیے معذرت کی جائے۔ کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے۔ تمہاری خالہ مرحومہ بھی یوں تو بہت شان دار کھانا پکاتی تھیں لیکن کبھی مزاج برہم ہوا یا انہیں کوئی پریشانی ہو تو پھر سارا عتاب کھانے پر ہی آتا تھا۔" مکرم علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ندا سے بولے۔

"ندا بیٹا! ذرا لاکر کھول کر اس میں سے سرخ رنگ کی تھیلی تو نکالو۔" ندا نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور ان سے چابیاں لے کر لاکر میں سے سرخ مخملیں تھیلی نکال کر ان کے سامنے لا رکھی۔

"اس تھیلی میں تمہاری امی کے زیورات ہیں۔ اپنی زندگی میں ہی انہوں نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کردیا تھا کہ یہ زیورات تم تینوں کے درمیان تقسیم ہوں گے۔" مکرم علی نے تھیلی کھول کر اس میں سے زیورات نکالتے ہوئے کہا۔

"شرعاً بیٹی کا حصہ بیٹے سے نصف ہوتا ہے۔ ندا اور اقصیٰ ہماری دو بیٹیاں ہیں اور حسن ایک بیٹا۔ میں نے کل جیولر کے ہاں جاکر زیورات کی مالیت کا اندازہ کرکے انہیں چار حصوں میں تقسیم کروالیا تھا۔ دو حصے حسن کے اور ایک حصہ تم دونوں کا۔" مکرم علی نے پلاسٹک کی تھیلیوں میں الگ الگ کرکے رکھے چاروں حصے ان تینوں کے سامنے رکھے۔

"اقصیٰ بیٹا! حسن کی منکوحہ ہونے کی حیثیت سے اس کے حصے کے زیورات بھی تمہیں ہی ملیں گے۔ یعنی تم حقیقت میں تینوں حصوں کی مالک بن جاؤ گی، اس لیے اگر میں انتخاب کا حق ندا کو دے دوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔" مکرم علی نے اقصیٰ سے پوچھا تو اس نے فوراً ہی نفی میں سرہلادیا۔

"مجھے زیورات وغیرہ کا تو اتنا شوق نہیں ہے لیکن امی جان کی کوئی نشانی میرے پاس ہو اس لیے میں اپنا حصہ ضرور لوں گی۔" ندا نے وہ حصہ منتخب کیا جس میں امینہ بیگم کا جڑاؤ گلوبند موجود تھا۔ حسن اس ساری کارروائی کے دوران خاموش بیٹھا رہا تھا۔

"مکان میں بھی تم چاروں کا حصہ اسی طرح ہے۔ اپنی زندگی تک میں اس مکان کو بکنے نہیں دوں گا۔ بعد میں حسن کی مرضی ہے کہ وہ اس کو بیچ کر تمہارا حصہ دے دے یا خود اس گھر میں رہتے ہوئے اس گھر کی جو مارکیٹ ویلیو ہو، اس کے مطابق تمہارے حصے کی رقم تمہیں ادا کردے۔"

"آپ اس طرح کیوں کررہے ہیں ابو! اللہ آپ کا سایا ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ ہمیں نہیں چاہئیں یہ حصے بخرے۔" مکرم علی کی بات پر ندا روہانسی ہوگئی تھی۔

"دل چھوٹا مت کرو بیٹا! میں تم لوگوں میں اپنے اثاثوں کی تقسیم کررہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا ہوں بلکہ یہ تو ایک شرعی فریضہ ہے۔ ماں باپ کو اپنی زندگی میں ہی یہ تمام فیصلے کرلینے چاہئیں تاکہ ان کے بعد ان کی اولاد میں ان معاملات پر تنازعہ نہ ہو۔ بطور مسلمان تو ہر شخص کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے پاس موجود مال سے متعلق اپنی زندگی میں وصیت کردے۔ کہتے ہیں کہ مومن پر دو راتیں اکٹھی ایسی نہیں گزرنی چاہئیں کہ اس نے اپنے مال کے بارے میں وصیت نہ کی ہو۔ اس اعتبار سے تو مجھے اس کام کو کرنے میں کافی تاخیر ہی ہوگئی ہے لیکن صد شکر کہ اس رب نے زندگی میں اور ہوش و حواس کے ساتھ وصیت کرنے کی توفیق عطا کردی۔" مکرم علی نے ندا کو سمجھایا اور پھر حسن

سے بولے۔

"حسن بیٹا! اگلے سال میں ریٹائر ہوجاؤں گا۔ وہاں سے جو میرے فنڈ وغیرہ ملیں گے اس کے لیے میرا ارادہ ہے کہ کسی رفاہی ادارے کو ڈونیٹ کردوں۔ میری گزراوقات کے لیے تو میری پنشن ہی کافی ہوگی۔ تم اور عامر دونوں اچھی نوکریوں پر ہو، اپنی زندگیاں اپنے بل بوتے پر گزار سکتے ہو، اس لیے مجھے اطمینان ہے کہ اس رقم میں سے کچھ نہ ملنے پر تم لوگوں کو کسی تنگی کا احساس نہیں ہوگا۔ میرے سارے بچے اپنے گھروں میں خوشحال زندگی گزارتے رہیں گے۔"

"آپ کا فیصلہ بہت اچھا ہے ابو! مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں اور میرے خیال میں کسی اور کو بھی نہیں ہوگا۔" حسن نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔

"مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ عامر بھی پیسے وغیرہ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اس لیے ان کی طرف سے بھی کسی اعتراض کا خدشہ نہیں۔" ندا نے بھی انہیں اطمینان دلایا۔

"آپ لوگ تنے اعلا ظرف ہیں تو بس ایک میرے باپ کے لیے ہی کیوں اپنے دلوں کو کشادہ نہیں کرسکے؟" لب بھینچے بیٹھی اقصیٰ کے دل میں شکوہ مچلا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ آئے کیوں نہیں تین دن سے۔ میں اتنی بے چینی سے آپ کا انتظار کرتی رہی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ پیر کو آؤں گا اور آج جمعرات ہے۔" وہ خود کو شکوہ کرنے سے نہ روک سکی تھی۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد تھا بیٹا! لیکن طبیعت اتنی خراب تھی کہ دو قدم چلنے کی بھی سکت نہیں تھی مجھ میں۔ اپنا وعدہ کیا خاک نبھاتا۔" تنویر خان نے بے چارگی سے کہا تو اقصیٰ نے بغور دیکھا۔

"یہ آپ کے نیل کیسا پڑا ہوا ہے؟" غور کرنے پر ہی اسے تنویر خان کی بائیں کنپٹی کے قریب پڑا نیل کا نشان بھی دکھائی دیا تھا۔

"بستر سے اٹھ کر باتھ روم جارہا تھا کہ چکرا کر گر گیا۔ اس چوٹ کے علاوہ بھی کافی چوٹیں آئی ہیں۔ ان چوٹوں کی وجہ سے ہی تو میں بالکل بے بس ہوگیا تھا، ورنہ کسی نہ کسی طرح تم سے ملنے آہی جاتا۔" تنویر خان نے اپنی آستین الٹ کر ہاتھ پر موجود چوٹ کا نشان دکھایا تو وہ تڑپ گئی۔

"کتنی بدقسمت ہوں میں کہ میرا باپ اتنا شدید بیمار ہے اور میں اس کی خدمت بھی نہیں کرسکتی۔" وہ رونے لگی۔

"مت روؤ بیٹا! یہ تمہاری نہیں، میری بدقسمتی ہے کہ صاحب اولاد ہوتے ہوئے بھی زندگی کے یہ آخری ایام لاوارثوں کی طرح گزار رہا ہوں۔ موت مقدر ہے اس بات پر تو کوئی شکوہ نہیں لیکن اس لمحہ لمحہ ختم ہوتی زندگی میں اگر تم میرے ساتھ ہوتیں تو میں سکون کی موت مرتا۔" وہ اقصیٰ کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر بظاہر اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

"نہیں جینے دوں گی میں آپ کو یہ بے بسی کی زندگی۔ آپ کا علاج ہوگا اور آپ لمبی زندگی جئیں گے۔" اقصیٰ نے روتے روتے سر اٹھا کر بہت عزم سے کہا۔ وہ فیصلہ جو وہ تین دن سے نہیں کرپارہی تھی، بالکل اچانک ہوگیا تھا۔

"تم کرہی کیا سکتی ہو بیٹا!" اقصیٰ کی بات پر تنویر خان کے کان کھڑے ہوئے لیکن بظاہر اس نے بہت لاچاری سے پوچھا۔

"بس آپ دیکھتے جائیں۔" اقصیٰ جوش میں بولتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے پاس ایک سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ تھا اور اس نے بڑا سا دوپٹہ خوب پھیلا کر اوڑھا ہوا تھا۔

"دو تین گھنٹے میں، میں واپس آجاؤں گی، تب تک تم سارا کام نمٹالینا اور ہاں دیکھو، اگر خالو جان مجھ سے پہلے گھر واپس آجائیں تو ان سے کہنا کہ میں اپنی دوست سے ملنے اس کے گھر گئی ہوں۔" وہ اپنے پیچھے موجود ملازمہ کو ہدایات دے کر تنویر خان کی طرف مڑی۔

"چلیں ابو! ہمیں جلدی واپس بھی آنا ہے۔"

"یہ سب کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ بیٹا!" تنویر خان کا تجسس عروج پہ تھا۔

"آپ چلیں تو، سب پتہ چل جائے گا۔" اقصیٰ نے تنویر خان کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ جیسے مجبوراً اس کے پیچھے چل پڑا۔ باہر روڈ پر آکر ان لوگوں نے ایک رکشہ رکوایا اور رکشہ اقصیٰ کے بتائی ہوئی منزل کی طرف دوڑنے لگا۔

مارکیٹ پہنچ کر اقصیٰ نے ایک جیولرز شاپ کا رخ کیا۔

"یہ کچھ زیورات ہیں، جنہیں میں بیچنا چاہتی ہوں۔" اقصیٰ نے اپنے ہینڈ بیگ سے زیورات کی تھیلی برآمد کی اور جیولر کے سامنے موجود کاؤنٹر پر رکھ دی۔

"آپ شاید انہیں بیچ کر نئے ڈیزائن کے زیورات خریدنا چاہتی ہیں۔" جیولر نے زیورات کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ لگاتے ہوئے اقصیٰ سے پوچھا۔

"جی نہیں، مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے' اس لیے میں ان زیورات کو بیچنا چاہتی ہوں۔" اقصیٰ نے اس کے اندازے کی تردید کی۔

"رسیدیں تو ہوں گی آپ کے پاس ان زیورات کی۔" جیولر نے کچھ محتاط انداز میں پوچھا۔

"جی بالکل۔" اقصیٰ نے اپنے بیگ سے رسیدیں بھی نکال کر سامنے رکھیں تو وہ مطمئن ہو گیا۔

"آپ بیٹھیں' کچھ دیر انتظار کریں۔ ٹانکوں' کھوٹ اور نگینوں کا حساب کتاب کر کے زیورات کی قیمت کا تعین کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔" جیولر نے کہا تو وہ اور تنویر خان ایک طرف موجود آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خلاف توقع تنویر خان بالکل خاموش تھا اور اس نے اب تک کی کارروائی میں کوئی دخل نہیں دیا تھا۔

جیولرز شاپ میں ان لوگوں کو توقع سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ گھڑی کی تیزی سے بھاگتی سوئیوں نے اقصیٰ کو احساس دلایا کہ مکرم علی گھر واپس آ چکے ہوں گے لیکن وہ مطمئن تھی کہ ملازمہ کو پہلے ہی اپنے تاخیر سے آنے کی صورت میں بہانہ بتا کر آئی تھی۔

"ایک لاکھ پچھتر ہزار قیمت بنتی ہے ان زیورات کی۔" جیولر نے بتایا تو اقصیٰ کے چہرے پر کچھ مایوسی چھا گئی۔ یہ رقم اس کی امید اور ضرورت دونوں کے مقابلے میں کافی کم تھی لیکن کیا ہی کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ہامی بھرتے ہوئے جیولر کو پے منٹ دینے کا عندیہ دیا۔

"ابو! یہ رقم آپ کے علاج کے لیے ہے۔ اگرچہ یہ کافی کم ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ میری ایک دوست کے فادر ڈاکٹر ہیں' میں ان سے بات کروں گی' وہ ہمارا رابطہ کسی ایسے ہارٹ سرجن سے کروا دیں گے جو کم فیس پر آپ کا آپریشن کرنے پر راضی ہو جائے۔" دکان سے باہر نکل کر اقصیٰ نے رقم تنویر خان کے حوالے کرنا چاہی۔

"نہیں بیٹا! میں تم سے یہ روپے نہیں لے سکتا۔ یہ زیورات یقیناً تمہیں تمہاری خالہ جان کی طرف سے ملے تھے۔ میں اس پیسے کو اپنے علاج پر لگانا حرام سمجھتا ہوں۔"

"پہلے میں بھی کشمکش کا شکار تھی لیکن پھر میں نے سوچا کہ جن لوگوں کی وجہ سے آپ اس حال کو پہنچے ہیں' اگر ان کا پیسہ آپ کے علاج پر خرچ ہو جائے تو اس میں ایسا کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ ایک طرح سے یہ ان لوگوں کی طرف سے آپ پر کی جانے والی زیادتی کا تاوان ہی ہو جائے گا۔" اقصیٰ نے تنویر خان کے انکار پر توجیہہ پیش کی۔

"لیکن پھر بھی بیٹا! میں تم سے یہ رقم کیسے لے سکتا ہوں۔" تنویر خان نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

"آپ اگر میری خوشی چاہتے ہیں تو آپ کو مجھ سے یہ رقم لینا ہی ہو گی۔" اقصیٰ نے اصرار کیا۔

"تم نے مجھے بے بس کر دیا ہے بیٹا!" تنویر خان کو ناچار وہ رقم قبول کرنا پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اقصیٰ اور یہاں۔" رکشے سے اترتی اقصیٰ کو پہچاننے میں اسے فقط ایک لمحہ ہی لگا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ موجود آدمی کو دیکھ کر تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنے جاننے والوں کی فہرست میں اس شخص کا نام و نشان بھی موجود نہیں تھا لیکن اقصیٰ جس طرح اس شخص کے ساتھ موجود تھی' اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ حسن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ آفس سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں مارکیٹ تک آیا تھا لیکن اس حیرت انگیز منظر نے اسے اس کا ضروری کام بھی بھلا دیا تھا۔ اقصیٰ اور وہ شخص ایک جیولرز شاپ میں گئے تھے۔ حسن ان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا یہ انتظار بہت طویل ثابت ہوا۔ پچھلے چند روز سے اقصیٰ جتنی ڈسٹرب دکھائی دے رہی تھی' اس منظر کا یقیناً اس سے کوئی تعلق تھا۔ حسن وہ تعلق جاننا چاہتا تھا' اس لیے صبر سے انتظار کرتا رہا۔ بالآخر اس کا صبر رنگ لایا۔ باہر نکلنے کے بعد اقصیٰ اور وہ آدمی کچھ دیر باہر کھڑے رہے۔ اقصیٰ اس آدمی کو ایک پھولا ہوا لفافہ دے رہی تھی جسے لینے سے شاید وہ انکار کر رہا تھا لیکن بہرحال اقصیٰ کے اصرار پر اس نے وہ لفافہ رکھ لیا اور پھر وہ لوگ حسن کی نظروں کے سامنے ایک رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد حسن گاڑی سے اترا اور اسی جیولرز شاپ میں داخل ہو گیا۔

"ابھی ابھی یہاں میری بیوی آئی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کچھ یہاں بیچ کر گئی ہے۔" اس نے محض

اندازے کی بنیاد پر ہی جیولر سے یہ سوال کیا تھا۔

"دیکھیے جناب! ہم نے باقاعدہ رسیدیں دیکھ کر زیورات خریدے ہیں' اس لیے آپ ہم سے کسی طرح کی پوچھ کچھ نہیں کر سکتے۔" جیولر نے حفظ ماتقدم کے تحت حسن کو آگاہ کیا۔

"میں آپ سے پوچھ گچھ نہیں کر رہا' میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ وہ زیورات مجھے ایک نظر دکھا دیں۔ وہ زیورات میری ماں کی نشانی ہیں لیکن میری بیوی کو ان کا ڈیزائن پسند نہیں' اس لیے وہ بہت دنوں سے انہیں بیچنے پر زور دے رہی تھی۔ اگر آپ نے مجھے وہ زیورات دکھا دیے تو میں انہیں خود خرید لوں گا۔ میرے خیال میں آپ کو تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے تو وہ زیورات کسی نہ کسی کو بیچنے ہی ہیں۔" حسن نے جیولر کو مطمئن کرنے کی لیے بہانہ بنایا جس پر اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ساتھی کو زیورات لانے کو کہا۔

"میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر وہ نئے ڈیزائن کے زیور لینا چاہتی ہیں تو میری شاپ سے لے سکتی ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ انہیں رقم کی ضرورت ہے' اس لیے وہ زیورات بیچ رہی ہیں۔" جیولر نے مزید بتایا۔

"ہاں' وہ چاہتی ہے کہ گھر کا فرنیچر وغیرہ چینج کر کے نئے سرے سے گھر کا انٹیریر کیا جائے۔ اسے اس سلسلے میں رقم چاہیے تھی لیکن چونکہ میں انکار کر رہا تھا' شاید اسی لیے اس نے یہ راستہ ڈھونڈا۔" حسن شرمندہ شرمندہ سا بہانوں پر بہانے بنا رہا تھا۔

"آجکل کی لڑکیاں ایسی ہی عاقبت نااندیش ہیں۔ ظاہری ٹوشا میں گھر لٹا کر رکھ دیتی ہیں۔ بھلا بتاؤ ساس نے کتنے چاؤ سے زیور چڑھایا ہو گا بہو کو اور بہو نے ذرا سی خواہش کی خاطر میاں کے علم میں لائے بغیر بیچ ڈالا۔" شاپ پر موجود دو گاہک خواتین میں سے ایک عمر رسیدہ خاتون نے تبصرہ کیا۔

اس دوران جیولر نے زیورات حسن کے سامنے رکھ دیے تھے۔ حسن نے فوراً ہی شناخت کر لیے۔ اپنی ماں کی نشانی کو اتنی بے دردی سے اور بلا اجازت بیچ دینے پر اسے اقصیٰ پر غصہ آنے لگا۔

"اگر آپ یہ زیورات خریدنا چاہتے ہیں تو ڈھائی لاکھ روپے ادا کر دیں۔ میں یہ سارا زیور آپ کے حوالے کر دوں گا۔" جیولر جس نے اقصیٰ کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کو دیکھتے ہوئے زیورات کی قیمت بہت کم لگائی تھی' زیورات کے لیے حسن کی بے قراری دیکھ کر عیاری سے بولا۔

"ٹھیک ہے' فی الحال میں آپ کو پچاس ہزار پے منٹ کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے رسید بنا دیں۔ کل میں آپ کو باقی کی رقم دے کر یہ زیورات لے جاؤں گا۔" حسن نے اپنا کریڈٹ کارڈ نکال کر جیولر کے سامنے رکھا۔ اس کے کارڈ میں فی الحال اتنے ہی اماؤنٹ کی گنجائش تھی۔ جیولر نے اسے رسید بنا کر دے دی تو وہ شاپ سے باہر نکل آیا۔ فی الحال اس نے آفس واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا' اس لیے آفس کال کر کے اپنے نہ آنے کی اطلاع دی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی گلی سے کچھ فاصلے پر تھا تو اس نے اقصیٰ کو رکشے سے گلی کے کونے پر اترتے دیکھا۔ حسن کے نزدیک آنے سے پہلے رکشہ روانہ ہو چکا تھا۔ وہ وہاں سے پیدل چل کر گھر کی طرف جاتی اقصیٰ کے قریب زن سے گاڑی نکال کر لے گیا اور گیٹ پر پہنچ کر زوردار ہارن دیا۔

☆ ☆ ☆

اقصیٰ نے حسن کی گاڑی کو تیزی سے اپنے برابر سے گزرتے دیکھا اور دھک سی رہ گئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ حسن نے اسے تنویر خان کے ساتھ رکشے سے اترتے دیکھ لیا ہو گا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ابھی وہ خود میں حسن کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے گیٹ تک پہنچنے سے قبل ہی گیٹ کھل چکا تھا اور حسن گاڑی اندر لے گیا تھا۔

"چلو بھئی اچھا ہے' اقصیٰ بھی آ گئی۔ اب سب مل کر ہی لنچ کریں گے۔" مکرم علی جو گیٹ بند کر رہے تھے' اقصیٰ کو دیکھ کر بولے۔

"یہ آج تم جلدی گھر کیسے آ گئے؟" انہیں خیال آیا تو وہ پلٹ کر گاڑی سے اترتے حسن سے پوچھنے لگے۔

"کچھ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی' اس لیے سوچا گھر چل کر تھوڑی دیر ریسٹ کر لوں۔" گھر کے اندرونی حصے کی طرف جاتی اقصیٰ نے حسن کی سنجیدہ آواز سنی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ملازمہ واپس جا چکی تھی اور کچن میں کھانا جوں کا توں رکھا تھا۔ اقصیٰ خاموشی سے کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگانے لگی۔

"بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن اکیلا تھا' اس لیے کھانے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اچھا ہے تم دونوں آگئیے' اب سب ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے۔" مکرم علی نے ایک بار پھر ان دونوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

"میں تو اپنی دوست کے ساتھ کھانا کھا کر آئی ہوں۔ آپ دونوں کھانا کھالیں۔" مارکیٹ سے واپس آتے ہوئے وہ تنویر خان کے اصرار پر ایک فاسٹ فوڈ شاپ سے اس نے برگر اور کولڈ ڈرنک لے لی تھی' اسی وجہ سے اسے گھر پہنچنے میں بھی مزید دیر ہو گئی تھی اور اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے تنویر خان کی بات کیوں مانی۔ اگر وہ سیدھی گھر آجاتی تو حسن سے اس طرح سامنا نہ ہوتا۔ وہ جانتی تھی کہ فی الحال حسن' مکرم علی کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہے لیکن بعد میں اس سے اس سلسلے میں بازپرس ضرور کرے گا۔ وہ اس کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ملازمہ نے بتایا تھا مجھے کہ تم اپنی کسی دوست سے ملنے گئی ہو۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ تم نے پہلے تو اپنا ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا اور نہ ہی تم کبھی اس طرح اکیلی اپنی دوستوں کے گھر جاتی ہو۔ کیا کوئی ایمرجنسی تھی؟" مکرم علی نے اقصیٰ کے انکار پر پوچھا۔

"جی... جی ہاں... اس کی امی کی طبیعت خراب تھی اور وہ اکیلی گھبرا رہی تھی' اس لیے جب اس نے فون کر کے اپنے گھر آنے پر اصرار کیا تو میں منع نہیں کر سکی۔" اقصیٰ نے بہانہ بنایا لیکن اس کے چہرے سے گھبراہٹ صاف ظاہر تھی۔ جسے حسن نے بطور خاص نوٹ کیا۔

"اچھی بات ہے۔ ضرورت کے وقت دوست ہی دوست کے کام آتے ہیں۔" اقصیٰ کی گھبراہٹ کو نوٹ تو مکرم علی نے بھی کیا تھا لیکن وہ یہی سمجھے تھے کہ وہ بنا اجازت جانے پر خوف سے گھبرا رہی ہے' اس لیے اس کی تشفی کے لیے نرم لہجے میں بولے لیکن حسن کی خود پر جمی نگاہوں کو محسوس کرتی اقصیٰ کو ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے قطروں کو بار بار ٹشو پیپر سے صاف کرنا پڑ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اقصیٰ سارا دن منتظر رہی تھی کہ حسن اس سے تنویر خان کے متعلق کسی قسم کا استفسار کرے گا لیکن حسن کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ دوسرے دن وہ اپنے معمول کے مطابق آفس نہیں گیا تھا۔ اقصیٰ ڈرتی رہی کہ کہیں اس کی موجودگی میں ہی تنویر خان اس سے ملنے نہ آجائے لیکن خیر رہی۔ حسن اپنے معمول سے تقریباً" ایک گھنٹہ لیٹ گھر سے روانہ ہوا تھا۔ اس دوران کام والی لڑکی نے آکر صفائی وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ جب وہ صفائی کے لیے حسن کے کمرے میں گئی تھی تو حسن نے اس سے کچھ سوالات کیے تھے۔ حسن کے سخت لہجے کی وجہ سے ملازمہ کو ان سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جوابات دینے پڑے تھے لیکن یہ بات اقصیٰ کے علم میں نہیں آسکی تھی۔ تنویر خان اپنے معمول کے وقت پر اقصیٰ سے ملنے آیا تھا اور اس نے آتے ہی اقصیٰ کے چہرے سے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔

"کیا بات ہے' آج میری گڑیا کے چہرے پر روزانہ جیسی رونق نہیں۔" اس نے پوچھا تو وہ کل کے واقعہ کے بارے میں تنویر خان کو آگاہ کرنے لگی۔

"میرا خیال ہے اس نے تمہیں اور مجھے ایک ساتھ رکشے میں نہیں دیکھا ہوگا یا پھر ہو سکتا ہے کہ دیکھا بھی ہو تو یہ خیال کیا ہو کہ تمہاری دوست کے گھر سے کوئی تمہیں چھوڑنے آیا ہے' اسی لیے اس نے تم سے کسی قسم کی پوچھ تاچھ نہیں کی۔" پوری بات سننے کے بعد تنویر خان نے خیال ظاہر کیا جو کسی حد تک اقصیٰ کو بھی درست محسوس ہوا۔

"بہرحال' اگر تمہیں پریشانی ہے تو آئندہ میں یہاں آنے سے پہلے تمہیں فون کر لیا کروں گا تاکہ اگر کوئی گھر میں موجود ہو تو مجھے بتا دو اور میں یہاں نہ آؤں۔" اقصیٰ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تنویر خان کو گھر کا ٹیلی فون نمبر دے دیا تھا۔

"میں سوچ کر آیا تھا کہ آج تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر چلوں گا تاکہ اگر کبھی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں تم سے ملنے یہاں نہ آسکوں تو تم تو میرا حال معلوم کرنے وہاں آسکو۔" تنویر خان نے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو اقصیٰ تذبذب میں پڑ گئی۔ کل وہ تنویر خان کے ساتھ باہر گئی تھی تو اچھی خاصی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ اب آج پھر باہر جاتی تو جانے کیا صورت حال پیش آتی۔

"اگر تم نہیں چلنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔ میں تو صرف تمہاری پریشانی کے خیال سے کہہ رہا تھا کہ کبھی

طبیعت خراب ہوئی اور میں نہ آسکا تو تم یہاں بیٹھی بیٹھی ہولتی رہو گی۔ میرا تو کوئی فون نمبر بھی نہیں ہے کہ جس پر فون کر کے تم خیریت معلوم کر سکو۔ مجھے تو خیر عادت ہی ہے' تکلیف کے دن تنہا گھر میں لوٹ پوٹ کر گزار تا ہوں۔ کبھی ایسی بے بسی ہوتی ہے کہ کوئی حلق میں دو گھونٹ پانی ڈالنے والا بھی نہیں ہوتا لیکن بس ڈھیٹ ہڈی ہوں' اس لیے کسی نہ کسی طرح گزارا ہو ہی رہا ہے۔"

تنویر خان نے اقصیٰ کو متذبذب دیکھا تو گلوگیر لہجے میں کہنے لگا۔ اقصیٰ' باپ کی بے بسی کا یہ قصہ سن کر رو نہ سکی اور ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اس نے ملازمہ کو بتایا تو اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر چپ ہو گئی۔ تنویر خان اسے شہر کے جس حصے میں لے گیا' وہ تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے مکانات پر مشتمل تھا۔ گلیوں میں جا بجا گندگی کے ڈھیر' ٹھہرا ہوا پانی اور ننگ دھڑنگ بچے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ ہے تمہارے باپ کا غریب خانہ جو تمہیں اچھا تو یقیناً نہیں لگے گا لیکن میری مجبوری ہے کہ میں اپنے رہنے کے لیے بس یہی جگہ افورڈ کر سکتا ہوں۔" ایک چھوٹے سے مکان کا تالا کھولتے ہوئے تنویر خان نے کہا۔

اقصیٰ نے مکان میں داخل ہو کر اس کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے اور صحن پر مشتمل اس مکان کے در و دیوار میں عجیب سی وحشت رچی ہوئی تھی۔ مکان میں موجود مختصر سا سامان سمیٹ کر رکھا گیا تھا۔ اس کے باوجود فرش اور چارپائی پر بچھی چادر کی حالت سے ظاہر تھا کہ یہاں صفائی کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ گھر کی فضا میں عجیب سی بو بسی ہوئی تھی۔ اقصیٰ کا جی متلانے لگا لیکن وہ تنویر خان کا دل رکھنے کے لیے مسکراتے ہوئے چارپائی کے ایک کونے پر ٹک گئی۔

"روزانہ تم میری خاطر مدارت کرتی ہو' آج میں تمہیں اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتا ہوں۔" تنویر خان کونے میں رکھے ہوئے اسٹوو کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اقصیٰ نے چائے کا پانی رکھنے کی غرض سے تنویر خان کی اٹھائی گئی دیگچی کو دیکھا۔ دیگچی کے کناروں پر موجود کالی تہہ اس بات کا ثبوت تھی کہ عرصے سے دیگچی کو ڈھنگ سے نہیں دھویا گیا۔ اس دیگچی میں بنی ہوئی چائے کو پینے کے خیال سے اقصیٰ کو ابکائی آنے لگی۔

"رہنے دیں ابو! اس وقت مجھے چائے کی بالکل بھی طلب نہیں۔ بس آپ یہاں آکر بیٹھ جائیں اور مجھ سے باتیں کریں۔" اس نے تنویر خان کو چائے بنانے سے منع کیا تو وہ دیگچی چھوڑ کر واپس اقصیٰ کے قریب آبیٹھا۔

"تنویر خان! کہاں ہو یار؟" ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ کوئی شخص باہر سے آواز لگاتے ہوئے اندر آگیا۔ ایک اجنبی کو سامنے پا کر اقصیٰ گھبرا سی گئی لیکن تنویر خان نے اسے تسلی دی۔

"یہ نور محمد ہے' میرا جگری دوست' اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"معاف کرنا یار! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اندر عورت بیٹھی ہے۔ ہم تو عادت کے مطابق یونہی منہ اٹھا کر اندر آگیا تھا۔" نور محمد نے معذرت کی تو اقصیٰ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ تنویر خان کا ہی ہم عمر وہ آدمی کچھ اس جیسی شخصیت کا ہی مالک تھا۔ نور محمد کی آنکھوں میں پڑے سرخ ڈورے اور پچکے ہوئے گال تنویر خان سے مماثل تھے۔ اپنی سرخ ڈوروں والی آنکھوں کے ساتھ وہ اقصیٰ کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اقصیٰ نے گھبرا کر نظریں جھکالیں اور آہستگی سے بولی۔

"ابو! مجھے گھر جانا ہے۔ دیر ہو گئی تو میرے لیے خالو جان کے سامنے کوئی بہانہ بنانا مشکل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! دل تو نہیں چاہ رہا کہ میں اپنے گھر آئی روشنی کو اتنی جلدی واپس جانے دوں لیکن تمہاری بھی اپنی مجبوری ہے' اس لیے روک بھی نہیں سکتا۔"

تنویر خان فوراً" ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ لوگ گھر بند کر کے رکشہ لینے باہر سڑک تک آئے تو نور محمد ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ نور محمد کی نگاہوں کی چبھن اپنے وجود پر محسوس کرتی اقصیٰ اندر ہی اندر بری طرح جزبز ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ...؟" اگلے روز اقصیٰ رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی تو حسن وہاں چلا آیا۔

"آپ کو اندر آنے سے پہلے اجازت لینی چاہیے تھی۔" وہ دوپٹہ ایک طرف رکھے وہ بہت ایزی انداز میں بیٹھی ہوئی تھی' اس لیے اس طرح اچانک حسن کے اندر آنے پر خجل ہو گئی۔

"میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اپنی بیوی کے بیڈ روم میں آنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت ہے۔" حسن نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے جس اطمینان سے یہ بات کہی، اس نے اقصیٰ کے پورے جسم میں پھریری سی دوڑا دی۔ ان کے نکاح کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ حسن نے اس سے اپنے رشتے کو جتایا تھا۔

"ویسے بائی دا وے، آپ خود اس لفظ "اجازت" سے آشنا ہیں، جو دوسروں کو اس کی نصیحت کر رہی ہیں۔" حسن کا انداز بے حد طنزیہ تھا۔ اقصیٰ سمجھ گئی کہ وہ بازپرسی کے لیے آیا ہے۔

"مجھے آپ سے کسی قسم کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔" اقصیٰ نے بے مروتی کا مظاہرہ کیا۔

"ضرورت ہے مسز اقصیٰ حسن! ضرورت ہے۔ یہ گھر صرف آپ کا نہیں کہ آپ جسے چاہیں یہاں بلائیں اور کوئی آپ سے پوچھنے والا بھی نہ ہو۔" حسن کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"صرف میرا نہیں لیکن میرا بھی ہے، اس لیے کم از کم مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنے باپ کو ملنے کے لیے یہاں بلا سکوں۔" اب حقیقت کو چھپانا مشکل تھا، اس لیے اس نے اعتراف کرلیا۔

"باپ.... کون سا باپ....؟ وہ شخص جس نے ساری زندگی پلٹ کر تمہارا حال نہیں پوچھا۔ آج وہ باپ ہونے کا دعوے دار بن کر یہاں آگیا ہے اور تم ہماری محبتیں بھول کر اس شخص کو سر آنکھوں پر بٹھا رہی ہو۔" حسن کی آواز میں طنز اور غصے کی آمیزش تھی۔

"محبت کے نام پر زیادتی کرنا کوئی آپ لوگوں سے سیکھے۔ اسی محبت کا سہارا لے کر آپ لوگوں نے مجھ سے میرا باپ چھین لیا۔ کیا جرم تھا میرے ابو کا؟ صرف یہی نا کہ وہ غریب تھے۔ خالہ اور خالو جان کو انہیں اپنے برابر بٹھاتے ہوئے توہین محسوس ہوتی تھی، اس لیے ان سے ان کی بیوی اور بچی کو چھین لیا گیا۔" وہ یکدم ہی پھٹ پڑی تھی۔

حسن حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم حقیقت سے واقف نہیں ہو اقصیٰ! تم سے جو کچھ تمہارے ابو نے کہا، تم نے اسے سچ جان لیا لیکن کچھ سچائیاں تم میری زبان سے بھی سنو۔ تنویر خان ایک عادی جواری اور شرابی شخص ہے۔ اس نے زرینہ خالہ پر زندگی کو اتنا تنگ کردیا تھا کہ انہیں مجبوراً ہمارے گھر میں پناہ لینی پڑی۔ میں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھنے کے بعد جو دن خاموشی سے گزارے ہیں، ان میں، میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا رہا۔ ایک ایک بات معلوم کی ہے میں نے اس شخص کے بارے میں۔ اس کی زندگی صرف آوارہ گردیوں میں اور جیل کے چکر کاٹتے ہوئے گزری ہے۔ اس کے سگے بھائی نے اس سے تعلقات ختم کر رکھے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی پولیس اسے جوئے کے ایک اڈے سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ دو دن تک حوالات میں رہنے کے بعد اپنے کسی دوست کی مدد سے وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہاں اس نے کیوں اور کس مقصد کے لیے آنا شروع کیا ہے یہ تو وہ زیادہ بہتر جانتا ہے لیکن میں تمہیں خبردار کردینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ نقصان ہوچکا ہے، بس اسی پر اکتفا کرلو اور ہمارے ساتھ ساتھ خود پر ظلم نہ کرو۔" حسن کا تیز لہجہ بتدریج دھیما ہوگیا تھا۔ اس کی آخری دو باتوں نے اقصیٰ کو بری طرح چونکایا۔ تنویر خان کا دو دن کے وقفے سے جسم پر چوٹوں کے نشان لے کر آنا اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ساتھ ہی حسن نے کسی نقصان کا ذکر کیا تھا تو کیا وہ جانتا تھا کہ اقصیٰ نے تنویر خان کو کیا کچھ دیا ہے، لیکن کیسے؟ یہ بات اقصیٰ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ حسن مزید کوئی وضاحت کیے بغیر اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

پیچھے اقصیٰ سوچوں کے گرداب میں گھری بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

فون کی گھنٹی ایک تواتر سے بج رہی تھی۔ بیزار سی اقصیٰ نے بہت سستی سے آکر ریسیور اٹھایا۔

"مجھے اقصیٰ سے بات کرنی ہے۔" اس کی "ہیلو" کے جواب میں ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"جی بات کر رہی ہوں۔" حیران ہوتی اقصیٰ نے کہا۔ بولنے والے کی آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔

"میں نور محمد بات کر رہا ہوں، تنویر خان کا دوست۔" دوسری طرف موجود شخص نے اپنا تعارف کروایا تو اقصیٰ کو تنویر خان کے گھر پر ملنے والا شخص یاد آگیا۔ ساتھ ہی اسے بے تحاشا پریشانی نے بھی گھیر لیا۔

"ابو خیریت سے تو ہیں نا؟" اس نے بے حد تشویش سے نور محمد سے پوچھا۔

"نہیں، تمہارے ابو ٹھیک نہیں ہیں۔ ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں

فون کر کے تمہیں بلاؤں۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" نور محمد نے اس کے اندیشوں کی تصدیق کرتے ہوئے اسے تنویر خان کا پیغام پہنچایا۔

"میں ابھی آرہی ہوں۔" اقصیٰ نے جلدی سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور چادر اوڑھ کر پرس اٹھایا اور کچن کی طرف بڑھی جہاں ملازمہ برتن دھو رہی تھی۔

"میں کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر جارہی ہوں۔ تم گیٹ بند کرلو۔" اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر پریشانی تھی۔

"خیریت تو ہے باجی! آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں۔" ملازمہ نے تشویش سے پوچھا۔

"میرے ابو کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے ملنے جارہی ہوں۔ تم ان کے لیے دعا کرنا۔" اقصیٰ کی آواز رندھ گئی تھی، وہ مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے گھر سے باہر نکلی اور سڑک پر آکر رکشے کے لیے نظریں دوڑانے لگی۔ جلد ہی اسے ایک رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر اس نے پتہ بتایا اور خود سر تھام کر بیٹھ گئی۔ عام حالات میں وہ یوں تنہا کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی لیکن اس وقت ہر جھجک اور خوف پر باپ کی محبت حاوی تھی۔ اس کا باپ بیمار تھا اور اس کا بیمار دل اپنی بیٹی کو پکار رہا تھا۔ بیٹی ایسے میں بھلا کیسے رک سکتی تھی، جلد ہی رکشے نے اسے اس کے مطلوبہ مقام تک پہنچا دیا۔ تنویر خان کے دروازے پر پہنچ کر اس نے شکر کیا کہ وہ ان پُرپیچ گلیوں میں بھٹکنے کے بجائے سیدھی یہاں پہنچ گئی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا شخص نور محمد تھا۔ اقصیٰ تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔ اندر کمرے میں تنویر خان اپنے بستر پر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ کمرے میں اس کے علاوہ ایک باریش بوڑھا آدمی اور دو درمیانی عمر کے آدمی اور بھی موجود تھے لیکن اقصیٰ کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف بستر پر موجود تنویر خان تھا۔ وہ لپک کر اس کے قریب آگئی۔

"ابو۔" تنویر خان کے سرہانے بیٹھتے ہوئے اس نے ہولے سے اسے پکارا۔ جواب میں تنویر خان نے فوراً آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر خود بھی اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا اور نڈھال سا ہو کر سر واپس تکیے پر رکھ دیا۔

"کیا ہوا تھا؟ طبیعت اچانک اتنی خراب کیوں ہوگئی؟" اقصیٰ نے باپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"بس بیٹا! جو روگ دل کو لگا ہے، وہ چین ہی نہیں لینے دیتا۔" تنویر خان نے بہت دکھی لہجے میں کہا تھا۔

"آپ کی طبیعت اتنی خراب ہے اور آپ گھر پر ہی ہیں، آپ کو تو فوراً ہسپتال جانا چاہیے تھا۔" اقصیٰ نے تنویر خان کے چہرے پر کھنڈی زردی اور اس کے ہولے ہولے کپکپاتے جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوا کھالی تھی میں نے۔ اس سے طبیعت سنبھل گئی ہے اور پھر اب تو تم بھی آگئی ہو۔ اب میں فوراً ٹھیک ہوجاؤں گا۔" تنویر خان نے کہہ کر پھر آنکھیں موند لیں۔

"کل لے گیا تھا میں اسے ڈاکٹر کے پاس۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے اس کی حالت بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جلد از جلد آپریشن ہونا چاہیے اور اس میں بھی بہت خطرہ ہے۔ پتہ نہیں آپریشن میں اس کی جان بچ بھی سکے یا نہیں۔" نور محمد قریب آکر سرگوشیوں میں اقصیٰ کو بتانے لگا۔ یہ سب سن کر اقصیٰ کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ ساتھ ہی اسے اپنی کوتاہی کا بھی خیال آیا۔ تنویر خان سے اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی دوست کے والد سے اس کے آپریشن کے سلسلے میں بات کرے گی لیکن حسن کے علم میں اپنی اور تنویر خان کی ملاقات کا معاملہ آجانے کے بعد وہ ذہنی طور پر اس قدر الجھ گئی تھی کہ اس کا دھیان اس معاملے کی طرف سے ہٹ گیا تھا لیکن اب تنویر خان کی حالت اسے پچھتاوؤں میں مبتلا کر رہی تھی۔

وہ اسی سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی کہ اس نے محسوس کیا تنویر خان کے جسم میں یکدم ہی اکڑاؤ سا پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے قبل کہ اقصیٰ کچھ سمجھتی، اس نے بری طرح تڑپنا شروع کردیا۔ اقصیٰ بری طرح گھبرا گئی۔ ایسے میں نور محمد ہی آگے بڑھا اور تنویر خان کے سرہانے رکھی ایک بوتل اٹھا کر اس میں سے ایک گولی نکال کر تنویر خان کی زبان کے نیچے رکھی۔ باقی افراد تنویر خان کے ہاتھ پیر سہلانے لگے۔ اقصیٰ حواس باختہ سی ٹکر ٹکر یہ ساری صورت حال دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر میں تنویر خان کی حالت سنبھل گئی۔

"ہم ابو کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔" اقصیٰ نے نور محمد سے کہا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" تنویر خان نقاہت زدہ آواز میں بولا۔

"پلیز ابو! آپ ضد نہ کریں۔ آپ کو اس وقت ہسپتال جانے کی ضرورت ہے۔" اقصیٰ نے تنویر خان کا ہاتھ تھامتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔ وہ اپنے ایک اور رشتے کو کھونے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے بار بار آنسو بہہ نکلتے تھے' جنہیں اسے صاف کرنے تک کا ہوش نہیں تھا۔
"میری ایک بات مانو گی اقصیٰ!" یکدم ہی تنویر خان نے اپنے ہاتھ پر موجود اقصیٰ کے ہاتھوں پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی آس سے پوچھا۔
"ایک نہیں' سو باتیں مانوں گی لیکن پہلے ہسپتال چلیں۔" اس نے ضد کی۔
"نہیں بیٹا! ہسپتال جا کر زندگی بڑھ جائے گی' اس کی کیا گارنٹی ہے لیکن اگر تم میری بات مان لو تو تمہارے باپ کی اس روتی بلکتی زندگی کو ایک خوشی ضرور مل جائے گی۔ میں مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کی خوشی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے دلہن بنا دیکھنا چاہتا ہوں۔" تنویر خان کی بات نے اقصیٰ کو گنگ کر دیا تھا۔
"تم بس ایک ہاں کر دو تو تمہارے باپ کا ڈوبتا دل سنبھل جائے گا۔ یہ محلے کے مولوی صاحب اور دو لوگ یہاں بیٹھے ہیں' ان کے سامنے میں تمہارا نکاح اپنی پسند کے آدمی سے کروا دیتا ہوں پھر تمہارا جہاں دل چاہے مجھے وہاں لے جانا۔ تمہاری خوشی دیکھنے کے بعد میں ہنس کے موت کو گلے لگا لوں گا۔" تنویر خان رقت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا اور اقصیٰ کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔
"یہ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" بالآخر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
"کیوں' کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا تمہیں اپنے باپ پر بھروسا نہیں۔ کیا تم اپنے باپ کو اتنا بھی مان نہیں دے سکتیں کہ وہ اپنی پسند کے شخص سے تمہاری شادی کر سکے یا پھر تم مجھے اس لائق ہی نہیں سمجھتیں کہ میں تمہاری زندگی کے بارے میں کوئی ایک فیصلہ ہی کر سکوں۔" تنویر خان کا سانس پھولنے لگا تھا۔
"یہ بات نہیں ہے ابو! لیکن میں مجبور ہوں۔ میرا نکاح حسن سے ہو چکا ہے۔" اقصیٰ کے انکشاف نے کمرے میں موجود افراد پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔
"تنویر خان۔ تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اپنی پہلے سے نکاحی بیٹی کا لالچ دے کر مجھ سے اتنی بڑی رقم اینٹھ لی تو نے۔" اس ساکت ماحول کو نور محمد کی غصے سے بھرپور آواز نے توڑا تھا جو اپنی بات کہنے کے بعد تنویر خان کی طرف لپکا تھا۔ شدید بیماری کا ناٹک کرنے والا تنویر خان پھرتی سے بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ اور نور محمد ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے اور اقصیٰ ساکت سی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔
"مجھے ابھی اور اسی وقت میری رقم واپس کر تو نے اس رقم سے اپنی بیٹی کا سودا کیا تھا میرے ساتھ' تو بیٹی مجھے نہیں دے سکتا' اس لیے سودا کینسل۔ فوراً میرا پیسہ نکال۔"
نور محمد مغلظات بکتا ہوا زور زور سے جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ اقصیٰ کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شخص جس کی محبت میں وہ سب کی محبتوں سے منحرف ہو گئی تھی' اس نے اسے بیچ ڈالا تھا۔ نور محمد اور تنویر خان کے درمیان جھگڑا جاری تھا' وہاں موجود افراد اس جھگڑے کے درمیان بیچ بچاؤ کی کوشش کر رہے تھے لیکن دونوں ہی افراد پر جنون طاری تھا۔ اقصیٰ نے اجنبی نظر سے جانوروں کی طرح لڑتے اپنے باپ کو دیکھا اور پھر اپنے لرزتی ٹانگوں کو بمشکل قابو کرتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کی سماعتوں نے اندر ہونے والے ایک دھماکے کی آواز سنی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی' یہاں اس نے زندگی کو اتنے مکروہ روپ میں دیکھا تھا کہ اسے خود اپنے دل سے جینے کی امنگ مٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی تیز رفتاری سے چلاتے حسن کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا۔ اس نے اقصیٰ کو تنویر خان کے سلسلے میں تنبیہہ کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ تنویر خان سے ملنے اس کے گھر چلی گئی تھی۔ حسن کو اس سے اتنی جرأت کی امید نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اقصیٰ زیادہ سے زیادہ تنویر خان کو گھر بلا کر اس سے ملتے رہنے پر ہی اکتفا کرے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا' اس نے تو محض کسی انجانے خدشے کے تحت گھریلو ملازمہ کو اپنا کانٹیکٹ نمبر دے کر اسے ہدایت کی تھی کہ اگر کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجائے تو وہ اسے آگاہ کر دے اور ملازمہ نے جب اسے فون کر کے یہ اطلاع دی کہ اقصیٰ تنہا اپنے باپ سے ملنے کے لیے گئی ہے تو اسے شدید غصہ آیا تھا۔ حسن کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق تنویر خان جس قماش کا بندہ تھا' اقصیٰ کا تنہا اس کے گھر جانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔
حسن جانتا تھا کہ تنویر خان کو کوئی بیماری نہیں' وہ پہلے بھی اقصیٰ کو دھوکا دے کر ایک بڑی رقم ہتھیا چکا ہے اور اب پھر اس نے طبیعت کی خرابی کے بہانے اقصیٰ کو اپنے گھر بلایا تھا تو یقیناً اس کے پیچھے کسی نیک ارادے کا امکان نہیں تھا۔ حسن کو کچھ غصہ ملازمہ پر بھی تھا جس نے فوری طور پر اسے فون کرنے کے بجائے کچھ وقت اس انتظار میں گزار دیا تھا کہ اقصیٰ گھر واپس آجائے گی لیکن اقصیٰ اپنے کہے کے مطابق جلد واپس نہیں آئی تو ملازمہ نے گھبرا کر حسن کو اطلاع دی۔ حسن ہر کام جوں کا توں چھوڑ کر آفس سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ لیکن غصے کے ساتھ ساتھ خدشات بھی تھے جو اسے ستا رہے تھے۔ اس علاقے کی سڑکیں تنگ اور ٹوٹی پھوٹی تھیں' اس لیے حسن کو گاڑی کی رفتار کم کرنی پڑی۔ وہ اس صورت حال پر اتنا پریشان تھا کہ اسے گاڑی کی اسپیڈ کم کرنے پر بھی الجھن محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر وہ چونک سا گیا۔ سیاہ چادر میں لپٹی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ لڑکی اقصیٰ تھی' یہ پہچاننے میں اسے محض دو سیکنڈ ہی لگے تھے۔ اس سے قدرے فاصلے پر ہونے کے باوجود وہ اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت اور چال میں موجود اضطراب کو محسوس کر سکتا تھا۔
"گاڑی میں بیٹھو۔" حسن نے اقصیٰ کے بالکل سر پر لے جا کر گاڑی روکی اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے تحکم بھری آواز میں کہا۔ اقصیٰ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اپنے نزدیک گاڑی رکنے پر وہ چونکی ضرور تھی لیکن حسن کو دیکھ کر خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ حسن سمجھتا تھا کہ اپنے یوں اس طرح پکڑے جانے پر وہ گھبرائے گی لیکن اس کے برعکس حسن کو اس کے سراسیمہ چہرے پر اطمینان کے رنگ اترتے محسوس ہوئے تھے۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے بہت تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ حسن جو اسے سخت سنانا چاہتا تھا' لب بھینچ کر رہ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اقصیٰ کسی انہونی سے گزر کر آئی ہے۔ وہ خوفزدہ ہی نہیں' دکھی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ اسے کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا

رہا۔

گھر پہنچنے پر بھی اقصیٰ زبان سے ایک لفظ کہے بنا گاڑی سے اتری اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حسن نہیں جانتا تھا کہ اس کے اس شکست خوردہ انداز کے پیچھے کیا وجوہات ہیں لیکن کچھ تو ہوا تھا' اس کا اسے یقین تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ فی الحال اقصیٰ اسے کچھ نہیں بتائے گی۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور پھر باہر نکل گیا۔ اسے آفس واپس جانا تھا کہ بہت سے ادھورے کام اس کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

"اقصیٰ باجی! آپ کو حسن بھائی بلا رہے ہیں۔" وہ بستر پر لیٹی یونہی چھت کو گھور رہی تھی کہ ملازمہ نے اسے پیغام پہنچایا۔

اقصیٰ نے سر گھما کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اس وقت حسن کے گھر پر ہونے کا مطلب تھا کہ آج اس نے آفس کی چھٹی کی تھی۔ اقصیٰ پچھلے کئی دنوں سے حسن کے سامنے نہیں گئی تھی جو کچھ تنویر خان نے کیا تھا' وہ بحیثیت بیٹی اس کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ وہ شرمندہ تھی کہ اس نے ایک بد قماش شخص کی باتوں میں آکر زندگی بھر خود پر احسان کرنے والوں کے خلوص پر شک کیا۔ ایک طرف اپنی احسان فراموشی پر شرمندگی تھی تو دوسری طرف تنویر خان کے گھناؤنے روپ نے اسے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر برسوں بعد ملنے والا اس کا باپ اسے بازار میں ملنے والی کسی جنس کی طرح فروخت کر چکا ہے۔ شدید دکھ اور شرمندگی نے اقصیٰ کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا' وہ کئی دن تک بیمار پڑی رہی تھی۔ بیماری کے اس عرصے میں ندا اس کے پاس رکی ہوئی تھی۔ اپنے بچوں کی پڑھائی' شوہر کی ذمہ داریاں اور سسرال کے جھمیلے سب کچھ چھوڑ کر اس نے اقصیٰ کی تیمارداری کی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب یونہی تو نہیں تھا' اتنی قربانیاں تو بس محبت میں دی جاتی ہیں اور اقصیٰ ان محبتوں کی ناقدری کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ وہ جتنا پچھتاتی کم تھا۔ خالو جان بھی اس کی بیماری کے عرصے میں اس کے لیے بہت متفکر رہے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے فریج میں تازہ پھلوں اور جوسز کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ وہ اس کے سگے باپ نہیں تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا سگا باپ مکرم علی کی قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں تھا۔ وہ شخص جس نے رشتوں کے تقدس کو پامال کر ڈالا تھا' درحقیقت باپ کہلانے کا بھی حقدار نہیں تھا۔

یہی سب سوچتی اقصیٰ اپنے بستر سے نیچے اتری۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا سر چکرایا لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔ بخار تو دو دن ہوئے اتر چکا تھا لیکن ابھی کمزوری باقی تھی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلی اور اوپری پورشن کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اتنے دنوں سے حسن اس کے سامنے نہیں آیا تھا اور نہ ہی اسے کچھ کہا تھا۔ شاید ندا کی موجودگی کے سبب اس نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی لیکن اب جبکہ ندا اپنے گھر جا چکی تھی تو اس نے فوراً" اقصیٰ کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا تھا۔ اقصیٰ نے سب کچھ سچ سچ بتا دینے کا عہد کرتے ہوئے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ۔" فوراً" ہی اجازت دی گئی۔ اقصیٰ دروازہ دھکیل کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ بہت زیادہ کنفیوز تھی۔ حسن کا سامنا کرنا بہت دشوار لگ رہا تھا۔ سب کچھ بتا دینے کا ارادہ کرنے کے باوجود کچھ بھی بولنا مشکل لگ رہا تھا۔

"بیٹھو۔" حسن بیڈ پر بریف کیس رکھے اس میں موجود اشیاء کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ سر اٹھا کر اقصیٰ کو دیکھے بغیر اس نے کہا تھا۔ اقصیٰ فوراً" ہی ایک کرسی پر ٹک گئی۔

"تین دن پہلے تمہارا رزلٹ آگیا تھا' تمہیں انفارم اس لیے نہیں کیا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور حسب توقع رزلٹ نہ پا کر تم مزید ڈپریسڈ ہو سکتی تھیں۔" حسن نے بے حد سنجیدگی سے اسے جو اطلاع دی' وہ عام حالات میں یقیناً اس کے لیے بہت سنگین ثابت ہوتی لیکن اب تو وہ ایسے حالات سے گزر آئی تھی کہ یہ بات معمولی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ عین ایگزامز کے دنوں میں امی کی وفات اور اچانک نکاح نے تمہیں جس ذہنی کرب میں مبتلا کیا تھا' اس کے اثرات تمہارے رزلٹ پر بھی پڑے ہیں لیکن تم فکر نہ کرو' میں نے معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ایک دو اچھی پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں جو ٹیسٹ کی بنیاد پر ایڈمیشن دیتی ہیں۔ ابھی تمہارے پاس کچھ دن ہیں' تم تیاری کر لو' ٹیسٹ کلیئر ہو گیا تو تمہارا ایڈمیشن ہو جائے گا۔"

اقصیٰ جن باتوں کی امید لے کر یہاں آئی تھی حسن اس کے برخلاف مسئلے کو ڈسکس کر رہا تھا۔ اقصیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ وہ شخص تھا جس کی ذات کی وہ پچھلے کئی مہینوں سے نفی کر رہی تھی اور وہ اس کی ناکامی کو بھی کامیابی میں بدل دینا چاہتا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو' میں نے کہا ہے کہ نا کہ تمہارا ایڈمیشن ہو جائے گا بس تم ٹیسٹ کی تیاری کر لو۔" حسن اپنے حساب سے اقصیٰ کے رونے کا جو مطلب سمجھا تھا' اسی کے مطابق اسے تسلی دینے لگا۔

"آپ مجھے معاف کر دیں' میں آپ کی ان نوازشوں کی حق دار نہیں ہوں۔" اقصیٰ نے روتے روتے بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کیا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں' اپنے دل کی خوشی سے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی نوازش نہیں' تمہارا حق ہے۔" حسن نے آہستہ سے اسے ڈپٹا۔

"آپ نہیں جانتے' آپ کو نہیں معلوم! میں کتنی بری لڑکی ہوں۔ میں نے آپ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ "خالہ جان کا جو زیور خالو جان نے مجھے دیا تھا' میں نے وہ سارا بیچ ڈالا اور اس شخص کے حوالے کر دیا جو ہرگز بھی اس کا حق دار نہیں تھا۔ اس شخص نے باپ کے روپ میں مجھے دھوکا دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا؟! اس نے میری قیمت وصول کر لی۔ اگر میں آپ کے نکاح میں نہیں ہوتی تو وہ اس روز اپنے بدمعاش دوست سے زبردستی میرا نکاح پڑھوا دیتا۔"

وہ روتے ہوئے اسے اس دن کی ہر بات بتانے لگی' جب وہ تنویر خان اور نور محمد کے درمیان ہونے والی ہاتھا پائی کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ حسن خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

"یہ لو' پانی پی لو۔" اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا اور اب بری طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ حسن نے پانی سے بھرا گلاس اس کے لبوں سے لگایا تو وہ چند گھونٹ لے کر سنبھل گئی۔ البتہ اتنا سب کچھ جان لینے کے بعد بھی حسن کا یوں پرسکون رہنا اسے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا' تب ہی اس سے پوچھ بیٹھی۔

"آپ کو یہ سب جان کر غصہ نہیں آیا؟"

"یہ سب جو تم نے آج بتایا ہے' ان میں سے بیشتر باتیں میں پہلے سے جانتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ اس وقت مجھے بہت غصہ بھی آیا تھا' خصوصاً" امی کا زیور بیچنے والی حرکت پر لیکن پھر میں نے خود کو تمہاری جگہ رکھ کر حالات کا تجزیہ کیا تو تمہارا عمل مجھے اتنا غلط محسوس نہیں ہوا۔ ایک نادان اور زمانے کی چالاکیوں سے ناواقف لڑکی کا تنویر خان کے جال میں پھنسنا' وہ بھی اس صورت میں کہ وہ اس کا باپ تھا اور بہت سی محبتوں کے باوجود اس لڑکی کے دل میں باپ کی محبت کے لیے ہڑک موجود تھی' کوئی بہت انوکھی بات نہیں تھی۔ بس پھر میرا غصہ ختم ہو گیا۔ یوں بھی تمہارے لیے میرے دل میں اتنی جگہ ہے کہ میں تمہاری بڑی سے بڑی غلطی کو بھی معاف کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

حسن کے آخری جملے پر اقصیٰ کے دل نے اچانک ہی ایک بیٹ مس کی لیکن پھر اسے بہت سی حقیقتیں یاد آگئیں۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔ حالات کے تحت آپ کو زبردستی مجھ سے باندھ کر آپ کے ساتھ شدید زیادتی کی گئی ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کسی بہت شاندار لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے اور میں تو کسی لائق ہی نہیں ہوں۔ سب لوگوں نے زبردستی مجھے آپ کے سر منڈھ دیا ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ گلے پڑا یہ ڈھول ضرور ہی بجائیں۔ آپ کو جب آپ کی پسند کی لڑکی ملے تو آپ ضرور اس سے شادی کر لیجیے گا۔ خالو جان اور ندا باجی کو میں خود راضی کر لوں گی۔" وہ بہت مدبرانہ حسن سے کہہ رہی تھی۔

"تھینک یو ویری مچ اقصیٰ! تم نے تو میری مشکل آسان کر دی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں اس بارے میں کس طرح بتاؤں۔" حسن نے ممنونیت سے کہا۔

"یعنی آپ نے سچ مچ کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟" اقصیٰ کو دل میں کچھ چبھا تھا۔

"پسند کر لی ہے' یہ جملہ کچھ غلط ہے۔ وہ لڑکی مجھے خود بخود ہی پسند آگئی ہے۔ تمہیں یاد ہے نا میں کہتا تھا کہ مجھے بس اس لڑکی کی تلاش ہے جسے دیکھ کر میرا دل خود سے "یس" بول اٹھے اور مجھے وہ لڑکی مل گئی۔" حسن کے چہرے پر موجود خوبصورت مسکراہٹ اس کی اندرونی خوشی کا پتہ دے رہی تھی۔

"کون ہے وہ' مجھے بھی ملوائیں۔" خود پر جبر کرتے ہوئے اقصیٰ حسن کی خوشی کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہی

تھی۔

"مل بھی لینا لیکن فی الحال تو اس کی تصویر دیکھ لو۔" حسن اپنے سامنے پڑا بریف کیس کھولنے لگا۔ اقصیٰ سانس روکے اسے بریف کیس سے وہ سفید لفافہ نکالتے دیکھتی رہی جس میں حسن کے کہنے کے مطابق اس کی من پسند لڑکی کی تصویر موجود تھی۔ اقصیٰ کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے لیکن وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی۔ اس پر بالکل اچانک ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ حسن کی زندگی میں اپنے سوا کسی اور کو برداشت نہیں کرسکتی تھی لیکن اس نے یہ جاننے میں بہت دیر کردی تھی۔ سامنے بیٹھا شخص اس کا شوہر تھا جس پر اس کا شرعی اور قانونی حق ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی حق نہیں جتا سکتی تھی' اس نے یہ سارے حقوق خود اپنے ہاتھوں ہی گنوائے تھے۔

لرزتے ہاتھوں سے حسن کا تھمایا ہوا لفافہ پکڑ کر اس نے اس میں موجود تصویر کو باہر نکالا۔ تصویر دھندلی تھی اور وہ تصویر میں موجود لڑکی کے گلابی لباس کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھ پارہی تھی۔ یکدم ہی اسے احساس ہوا کہ تصویر دھندلی نہیں بلکہ دھند اس کی اپنی آنکھوں میں اتری ہوئی ہے۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔ اس بار اسے بہت زور کا جھٹکا لگا۔ تصویر میں گلابی جوڑے میں موجود لڑکی وہ خود تھی۔ یہ تصویر یقیناً ان تصویروں میں سے ایک تھی جو ان کے نکاح والے دن عامر نے اتاری تھیں۔

"کیا ہوا' تمہیں میری "پسند" پسند نہیں آئی۔" حسن نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آپ میرے ساتھ مذاق کررہے ہیں۔" اقصیٰ ناراضی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ مذاق نہیں' میری زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے۔" حسن اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔

"لیکن کیسے؟" اقصیٰ ابھی بھی الجھی ہوئی تھی۔

"کیسے۔۔۔؟ یہ تو مجھے خود بھی نہیں پتہ۔ بس بالکل اچانک ہی یہ سب کچھ ہوگیا۔ میں تو صرف ابو کا مان رکھنے کے لیے اس نکاح پر راضی ہوا تھا لیکن جب نکاح کے بعد تم پر پہلی نظر ڈالی تو دل یکدم ہی "یس" بول اٹھا۔ میرے لیے تو خود یہ ایک انکشاف ہی تھا لیکن میں نے اسے فوراً قبول کرلیا۔ سچ کو قبول کرلینے میں عافیت ہوتی ہے لیکن تم نے مجھے بڑا ستایا۔ ہر بار مجھے رد کرتی رہیں۔ اگر میں تمہیں اتنی اچھی طرح نہ جانتا ہوتا تو تمہارے ان رویوں کا کوئی ایسا سبب سمجھ بیٹھتا جو تمہارے حق میں یقیناً اچھا نہ ہوتا۔"

اقصیٰ نے حسن کی مبہم بات کا مفہوم بہت اچھی طرح سمجھا تھا اور اندر ہی اندر تھرا گئی تھی۔ واقعی اگر حسن کو اس پر کسی قسم کا کوئی شک ہوجاتا تو ان کے درمیان موجود رشتہ قائم رہنا مشکل تھا۔

"میں نے کبھی آپ کو رد نہیں کیا۔ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ آپ نے اپنی مرضی کے بغیر مجھے قبول کیا ہے اور میں کسی بوجھ کی طرح آپ کی زندگی میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ آپ سے مجھے ہمیشہ محبت ملی تھی اور میں اس محبت کو ناگواری اور مجبوری میں بدلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی' بس اس لیے وہ سب کچھ کرتی چلی گئی جو آپ کا دل دکھانے کا سبب بنا۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے وہ جھکی ہوئی نظریں لیے وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے ہمیشہ تمہیں محبت دی ہے اور ہمیشہ دیتے رہنا چاہتا ہوں۔ کیا تم محبت کے اس سفر میں میری ہم سفر بننا پسند کروگی؟"

حسن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا۔ اقصیٰ کی نظروں کے ساتھ سر بھی جھک گیا۔ اس کے چہرے پر اتنے خوبصورت رنگ پھیلے کہ زبان سے کسی لفظ کے ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ان رنگوں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے حسن اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے آگے بڑھا اور اپنی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ حسن نے الماری کھول کر ایک باکس نکالا اور اقصیٰ کے ہاتھوں میں تھمایا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ذرا کی ذرا حیران ہوئی۔

"خود کھول کر دیکھ لو۔" حسن نے کہا تو اس نے باکس کھولا اور پھر اس میں موجود لعبینہ بیگم کے زیورات دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ کو کیسے ملے؟" جواباً حسن نے اسے جیولرز شاپ پر دیکھنے سے لے کر زیورات دوبارہ خریدنے کی تمام تفصیل سنا ڈالی۔ یہ سب سن کر اقصیٰ خود پر بالکل بھی قابو نہیں رکھ سکی اور حسن کے شانے سے سر ٹکا کر رو پڑی۔ حسن اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے تسلی دینے لگا۔

اقصیٰ کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے' وہ کبھی

بھی اسے دکھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے اقصیٰ سے تنویر خان کا انجام چھپالیا تھا۔ تنویر خان اور نور محمد کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے میں تنویر خان نے نور محمد پر گولی چلادی تھی جس سے نور محمد موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ تنویر خان آج کل پولیس کی تحویل میں تھا اور اس کے سابقہ مجرمانہ ریکارڈ کی موجودگی میں اس کے قتل کے اس مقدمے سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ تنویر خان نے نور محمد اور اپنے درمیان ہونے والے تنازعے کی اصل وجوہات بیان نہیں کی تھیں اور اس جھگڑے کو دو جواریوں کے درمیان پیسے پر ہونے والے جھگڑے پر ہی محمول کیا گیا تھا۔ موقع پر موجود باقی تین افراد نے بھی اس معاملے میں اپنی زبانیں بند رکھی تھیں اور تھانے کچہری کے چکر میں پڑنے کے بجائے خود کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

یوں اس سارے قصے میں اقصیٰ کا نام کہیں نہیں آیا تھا جس کے لیے حسن اللہ کا شکر گزار تھا۔ اقصیٰ اس کی بیوی تھی اور وہ اس کی کسی کوتاہی کو اپنے سگے باپ اور بہن کے علم میں بھی نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ اچانک گیٹ پر کسی گاڑی کے رکنے اور پھر ہارن کی آواز سنائی دی۔ حسن نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر جھانکا۔

"نصرت پھپھو اور عصمت پھپھو آئی ہیں۔" باہر دیکھتے ہوئے اس نے اقصیٰ کو اطلاع دی تو وہ رونا بھول کر ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوئی۔

"رک جاؤ نا یار! اچھا ہے میری دونوں پھپھیاں یہ منظر دیکھ لیں تو نکاح کی طرح رخصتی بھی ابھی کھڑے کھڑے ہی انجام پاجائے گی۔" حسن نے اقصیٰ کو تنگ کرنے کے لیے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"رخصتی میرے ٹیسٹ کے بعد کروائیے گا۔" وہ گھبرا کر جلدی سے بولی تھی۔

"نہیں بھئی' تمہارا کوئی بھروسا نہیں' بعد میں تم رخصتی کی تاریخ اپنی تعلیم مکمل ہونے تک بڑھوا لوگی۔" حسن نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

"میں ایسا نہیں کروں گی۔ اب تو خود میرے لیے آپ سے دور رہنا ممکن نہیں۔" دونوں پھپھیوں کی دہشت تھی شاید جس نے اقصیٰ سے اتنا واضح اعتراف کروا ڈالا۔

"تمہاری زبان سے یہ اعتراف سن کر اب تو میرا اور بھی دل نہیں چاہ رہا کہ تمہیں یہاں سے جانے دوں۔" حسن اسے زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"پلیز حسن!" حسن کو اس کے اپنا نام پکارنے کی یہ ادا اتنی بھائی کہ فوراً ہی اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اقصیٰ سرپٹ باہر کی طرف دوڑی۔

اس کے اس انداز پر حسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سادگی اور معصومیت کا امتزاج یہ لڑکی اس کی رگ جاں سے بہت قریب تھی اور وہ دن دور نہیں تھا جب اپنی خوشبو اس کے کمرے میں چھوڑ کر جانے والی لڑکی خود یہاں آکر بس جاتی۔ ان لمحوں کا تصور کرکے حسن کو اپنے دل میں خوشیوں کی بارات اترتی محسوس ہوئی۔